مسلسل اشاعت کے 60 سال

جُمادی الاُخریٰ ۱۴۴۸ھ
نومبر ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حقیقتِ نفاق" از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- امیرِ تنظیمِ اسلامی کا پیغام
- اقامتِ دین کے مطالبات
- تزکیۂ نفس
- شعورِ مقصد اور غلبۂ دین کی جدّوجُہد
- سیرتِ رسول اللہ ﷺ: فکری اور عملی اسباق
- سالانہ اجتماع کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ
- پاکستان میں اِسلامی اِنقلاب: کیا، کیوں، کیسے؟

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیان القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈلیوری کے ساتھ

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1250 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ

میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 75
شمارہ : 11
جُمادی الاُخریٰ 1448ھ
نومبر 2026ء
فی شمارہ : 60 روپے
سالانہ زرِتعاون : 600 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
• رضاء الحق • ایوب بیگ مرزا
• خورشید انجم • وسیم احمد

معاون مدیران
• محمد خلیق • حافظ محمد زاہد

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375 (042)
ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

پبلشر: سکریٹری دین حق ٹرسٹ، لاہور مطبع: آر آر پرنٹرز، سنگیاں روڈ، لاہور

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  شعورِ مقصد اور غلبۂ دین کی جِدّ و جُہد — رضاء الحق
- **آوازِ جرس** — 11
  امیر تنظیم اسلامی کا پیغام — ادارہ
- **تذکرہ و تبصرہ** — 13
  سیرتِ رسول اللہ ﷺ: فکری اور عملی اسباق — شجاع الدین شیخ
- **درسِ قرآن** — 27
  سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۱۳) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **ابوظبی سیریز** (۷) — 49
  حقیقتِ نفاق (۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تیز ترک گامزن** — 63
  سالانہ اجتماع کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **دعوت و عزیمت** — 71
  اقامتِ دین کے مطالبات — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
- **دعوتِ فکر** — 79
  تزکیۂ نفس — ایوب بیگ مرزا
- **فرائضِ دینی** — 82
  پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں، کیسے؟ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **انوارِ ھدایت** — 96
  رشتہ داروں کے حقوق — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

❁❁❁

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شعورِ مقصد اور غلبۂ دین کی جِدّ و جُہد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بے مقصد پیدا نہیں کیا‘ نہ ہی اس کی زندگی کا حاصل محض معاشی آسودگی‘ مادی ترقی اور دنیوی کامیابیوں کا حصول ہے۔ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد اپنے خالق کی بندگی اختیار کرنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اُس کے عطا کردہ احکام کے تابع کرنا ہے۔ یہی بندگی انسان کی انفرادی زندگی کو پاکیزگی عطا کرتی ہے اور جب یہی تصور اجتماعی زندگی کی بنیاد بن جائے تو معاشرے میں عدل و انصاف‘ خیر و صلاح اور حقیقی فلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ تاہم اِس مقصد کا شعور محض نظریاتی اعتراف سے پیدا نہیں ہوتا‘ بلکہ اس کے لیے ایمان کی مسلسل تجدید‘ قرآن و سنت سے وابستگی اور عملی جِدّ و جُہد ناگزیر ہے۔

آج اُمّتِ مُسلمہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنی اجتماعی زندگی میں ان تعلیمات کی مکمل رہنمائی سے محروم ہے۔ عبادات اور مذہبی رسوم سے وابستگی اپنی جگہ‘ لیکن سیاست‘ معیشت‘ معاشرت اور اجتماعی نظمِ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو عملاً تسلیم کرنے کا تقاضا پورا نہیں ہو رہا۔ نتیجتاً مسلم معاشرے بھی انہی مسائل‘ ناانصافیوں‘ استحصال اور اخلاقی زوال کا شکار ہیں جن سے نجات کے لیے اسلام انسانیت کو ایک جامع نظامِ زندگی عطا کرتا ہے۔ اس صورتِ حال میں ضرورت محض اصلاحِ احوال کی خواہش کا اظہار کرنے کی نہیں‘ بلکہ ایسی ہمہ گیر جِدّ و جُہد کی ہے جو انسانوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرے‘ اُن کے اذہان میں مقصدِ زندگی کو واضح کرے اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کے تابع بنانے کے لیے منظم کوشش کرے۔

تنظیم اسلامی اِسی بنیادی تصور کے تحت قائم کی گئی تھی کہ دینِ اسلام محض چند انفرادی عبادات یا نجی زندگی کے بعض معاملات تک محدود نہیں‘ بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ہر مسلمان کا نصب العین اللہ کی رضا اور اُخروی نجات کا حصول ہونا چاہیے اور اِس دور کے ہر مسلمان کو اپنی

زندگی کا ہدف اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی جِدّ و جُہد میں کسی اجتماعیت سے جُڑ کر حصّہ ڈالنا بنانا چاہیے۔ یعنی پہلے افراد کی زندگی میں ایمان‘ اطاعت اور تقویٰ کی بنیاد مضبوط ہو‘ پھر ایک منظم جماعت کی صورت میں قرآن و سُنّت کی رہنمائی کے مطابق اجتماعی زندگی کی اصلاح اور دین کے قیام کے لیے کوشش کی جائے۔

یہ جدّ و جُہد کسی وقتی سیاسی کامیابی‘ اقتدار کے حصول یا محض افراد کی تعداد بڑھانے تک محدود نہیں۔ اِس کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا‘ آخرت کی جواب دہی اور دین کے تقاضوں کی ادائیگی ہے۔ تنظیم اسلامی کا تصور یہ ہے کہ جب تک انسانوں کے دلوں میں ایمان راسخ نہ ہو‘ اُن کے اذہان میں منزل واضح نہ ہو اور اُن کی زندگی میں اطاعت و نظم پیدا نہ ہو‘ اُس وقت تک کسی پائیدار اسلامی تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے اس جِدّ و جُہد کا آغاز فرد کی اصلاح اور اُس کی ایمانی و فکری تربیت سے ہوتا ہے‘ لیکن اِس کا ہدف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتا؛ وہ معاشرے اور اجتماعی نظام کی اصلاح کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

اقامتِ دین کی یہ جِدّ و جُہد قرآن مجید اور سُنّتِ رسول ﷺ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ قرآن ہمیں مقصدِ حیات‘ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کا شعور عطا کرتا ہے‘ جب کہ سیرتِ نبوی ﷺ اِس مقصد کے حصول کے عملی طریقے اور مراحل کی وضاحت کرتی ہے۔ چنانچہ دین کے غلبے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ محض منزل کا نام جاننے پر اکتفا نہ کریں‘ بلکہ اس راستے کو بھی سمجھیں جس کی رہنمائی قرآن و سُنّت نے کی ہے۔ مقصد درست ہو مگر طریقِ کار غیر واضح ہو‘ یا جذبہ تو موجود ہو مگر اس کے ساتھ علمی و عملی تربیت نہ ہو‘ تو جدّ و جُہد اپنی سمت کھو سکتی ہے۔

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع اِسی فکر و عمل کی تجدید کا ایک اہم موقع ہے۔ چار مقامات پر ۷ نومبر ۲۰۲۶ء سے شروع ہونے والے زونل اجتماعات محض ایک تنظیمی سرگرمی یا افراد کے جمع ہونے کا نام نہیں‘ بلکہ اِس کا اصل مقصد رفقاء کے ایمان کو تازگی بخشنا‘ اُن کے شعورِ مقصد کو نکھارنا‘ منہجِ عمل کو واضح کرنا اور باہمی اخوت و نظم کو مضبوط بنانا ہے۔ اِس اجتماع کی افادیت کو سمجھنے کے لیے اِس کے چار بنیادی مقاصد پر غور کرنا ضروری ہے۔

اوّل: ایمان کی تجدید اور ایمانی کیفیات کی بحالی

انسان کا دل بھی غفلت‘ دنیا کی محبت اور مسلسل مصروفیات کے باعث زنگ آلود ہو جاتا

ہے۔ ایمان کی بنیادی حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے‘ لیکن اِس کے عملی تقاضوں کے لیے درکار حرارت اور جذبہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دلوں کے زنگ کا ذکر کرتے ہوئے اِس کے علاج کے طور پر موت کی کثرت سے یاد اور قرآن مجید کی تلاوت کی طرف رہنمائی فرمائی۔

دنیا کی مصروفیات انسان کو یہ بھلا دیتی ہیں کہ اُس کی اصل منزل آخرت ہے جبکہ یہ زندگی ایک عارضی سفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ موت کو کثرت سے یاد کرنے سے انسان یہ بات نہیں بھولتا کہ وہ کہیں جواب دہ بھی ہے‘ جب کہ قرآن مجید کی تلاوت اور اُس میں غور وفکر انسان کے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ چنانچہ سالانہ اجتماع کا پہلا مقصد یہ ہے کہ رفقاء روزمرہ کی مصروفیات سے نکل کر کچھ وقت اپنی روحانی وایمانی کیفیت کی اصلاح کے لیے وقف کریں۔ قرآن وسُنّت کے دروس‘ ذکر وتلاوت اور دینی ماحول سے وابستگی کے ذریعے اپنے اندر وہ عزم اور ولولہ پیدا کریں جو ایک طویل جِدّوجُہد کے لیے ضروری ہے۔

یہ بات رفقا کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اجتماع میں شرکت اُسی وقت حقیقی معنوں میں مفید ہوگی‘ جب اس کے اثرات اجتماع گاہ سے باہر بھی محسوس ہوں۔ اگر چند روزہ دینی ماحول انسان کو وقتی طور پر متاثر کرے لیکن واپسی پر اُس کی زندگی کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئے تو مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ اجتماع سے حاصل ہونے والی ایمانی تازگی انسان کے کردار‘ عبادات‘ معاملات اور دعوتی جِدّوجُہد میں نمایاں ہو۔

دوم: مقصدِ زندگی اور منہجِ عمل کا شعور

تنظیم اسلامی کے رفقاء اپنے ہدف اور اُس کے حصول کے طریقِ کار کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھیں۔ کسی بھی جدّوجُہد میں محض سرگرمی کافی نہیں ہوتی بلکہ یہ شعور ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کہ یہ کام کیوں کیا جا رہا ہے‘ اِس کی منزل کیا ہے اور اِس منزل تک پہنچنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ رفقاء اگر مسلسل مصروف بھی رہیں مگر اُنہیں اپنی جدّوجُہد کے مقصد اور اس کے مراحل کا واضح ادراک ہی نہ ہو تو اُن کی محنت مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔

اقامتِ دین کا فریضہ ایک سنجیدہ‘ ہمہ گیر اور صبر آزما جِدّوجُہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید سے براہِ راست رہنمائی‘ سُنّتِ رسول ﷺ کے عملی نمونے اور سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف مراحل کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ قرآن اور سُنّت کو ایک دوسرے سے

الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا؛ قرآن مقصد‘ اصول اور ہدایت فراہم کرتا ہے‘ جب کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت وسیرت ان اصولوں کے عملی نفاذ کی روشن مثال پیش کرتی ہے۔

آج فکری انتشار‘ مختلف نظریات اور متضاد دعوتوں کے ماحول میں یہ امکان موجود رہتا ہے کہ انسان اپنی منزل کے بارے میں تذبذب کا شکار ہو جائے یا کسی دوسرے طریقِ کار کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جائے۔ ایسے میں سالانہ اجتماع رفقاء کو اپنے نصب العین‘ ہدف اور ہدف کو حاصل کرنے کے منہج عمل پر از سرِ نو غور کرنے‘ سوالات کے جواب تلاش کرنے اور اپنی فکری سمت کو درست رکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اِس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ رفقاء تنظیمی سرگرمیوں میں محض روایت یا معمول کے تحت شریک ہونے کے بجائے شعوری وابستگی اختیار کریں۔ جب مقصد واضح ہو اور طریقِ کار کا ادراک بھی موجود ہو تو مشکلات کے باوجود استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

سوم: باہمی تعارف‘ دینی اخوت اور محبت کا فروغ

کسی بھی منظم جدّوجُہد کی کامیابی کے لیے افراد کا ایک دوسرے سے جڑا ہونا ضروری ہے۔ ایک مشترک مقصد افراد کو قریب تو لاتا ہے‘ لیکن ان کے درمیان اعتماد‘ خیر خواہی اور باہمی محبت پیدا کرنے کے لیے مسلسل رابطہ اور ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت بھی درکار ہوتی ہے۔ تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والے رفقاء کو باہم ملنے اور اپنے دینی تعلق کو مضبوط بنانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اسلام میں باہمی محبت محض معاشرتی خوش گوار تعلق کا نام نہیں‘ بلکہ جب یہ محبت اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین کی سربلندی کے لیے ہو تو اِسے غیر معمولی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں اِن لوگوں کے لیے بشارتیں وارد ہوئی ہیں جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے‘ اسی مقصد کے لیے مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کا تعلق قائم رکھتے ہیں۔ یہ محبت کسی شخص کی ذات یا گروہی مفاد کے گرد نہیں گھومتی‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کے تقاضوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اجتماع میں شرکت کرنے والے رفقاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ پروگراموں میں حاضری کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے تعارف اور رابطے کے لیے بھی وقت نکالیں۔ کسی ساتھی کی مشکلات کو سمجھنا‘ اُس کے تجربات سے فائدہ اٹھانا‘ نئے رفقاء کی رہنمائی کرنا اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو پہچاننا اجتماعی قوت میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔ دینی اخوت کا حقیقی تقاضا ہے کہ اختلافِ مزاج یا فہم میں فرق کے باوجود خیر خواہی کا دامن

ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور مشترک نصب العین اور ہدف کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

چہارم: نظم وضبط اور اجتماعی ذمہ داری کا شعور

تنظیم اسلامی ایک منظم جماعت کی صورت میں اقامتِ دین کی پُرامن، غیر مسلح جِدّ وجُہد کرتی ہے، چنانچہ اس کے رفقاء کے لیے نظم وضبط کی اہمیت کو سمجھنا اور اسے اپنی عملی زندگی کا حصّہ بنانا ناگزیر ہے۔ محض افراد کی کثرت کسی جماعت کو مؤثر قوت نہیں بنا دیتی؛ اس کے لیے مقصد کی یکسانیت، ذِمّہ داریوں کی ادائیگی، باہمی اعتماد اور طے شدہ نظم کی پابندی ضروری ہے۔ بے ترتیبی اور انفرادی پسند و ناپسند اجتماعی کوششوں کو کمزور کر سکتی ہیں، جب کہ نظم وضبط محدود وسائل کے باوجود بڑی جدّ وجُہد کو مؤثر بنا سکتا ہے۔

سالانہ اجتماع اِس نظم کی عملی تربیت کا بھی موقع ہے۔ وقت کی پابندی، پروگراموں میں ذِمّہ داری کے ساتھ شرکت، منتظمین سے تعاون، اجتماعی سہولتوں کا خیال اور دوسروں کی ضروریات کا احترام بظاہر چھوٹی باتیں ہیں، لیکن یہ ایک منظم جماعت کے مزاج کی تشکیل کرتی ہیں۔ اگر کسی انتظامی معاملے میں کوتاہی ہو تو اِسے بدگمانی، تنقید برائے تنقید یا بدنظمی کا سبب بنانے کے بجائے خیر خواہی کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ نظم کا حقیقی حسن تو یہ ہے کہ اِس میں ذِمّہ داری کے ساتھ شائستگی، اطاعت کے ساتھ شعور اور اختلاف کے باوجود باہمی احترام موجود ہو۔

یہ تربیت اجتماع تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ تنظیم کے رفقاء کو اپنی گھریلو، معاشرتی اور دعوتی زندگی میں بھی نظم، ذِمّہ داری اور وقت کی پابندی کا نمونہ بننا چاہیے۔ جس جماعت کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہو، اُس کے اپنے طرزِ عمل میں اصلاح، دیانت اور ذِمّہ داری کی جھلک نمایاں ہونی چاہیے۔

سالانہ اجتماع کے یہ چاروں مقاصد ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایمان کی تجدید انسان کو جدّ وجُہد کا جذبہ دیتی ہے؛ مقصد اور منہج کا شعور اِس جذبے کو درست سمت فراہم کرتا ہے؛ باہمی محبت اور اخوت اس جدّ وجُہد کو اجتماعی قوت میں بدلتی ہے؛ اور نظم وضبط اِس قوت کو مؤثر اور نتیجہ خیز بناتا ہے۔ اِن میں سے کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو مجموعی جدّ وجُہد متاثر ہو سکتی ہے۔

تاہم اجتماع کی کامیابی کا فیصلہ صرف شرکاء کی تعداد، پروگراموں کی وسعت یا انتظامی کامیابی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اصل سوال یہ ہے کہ اِس اجتماع سے واپس جانے والے افراد اپنے اندر کیا تبدیلی لے کر جاتے ہیں؟ کیا اِن کے دلوں میں ایمان کی حرارت بڑھی؟ کیا اُنہیں اپنے نصب العین، ہدف اور اور طریقِ کار کا شعور پہلے سے زیادہ واضح ہوا؟ کیا اُن کے باہمی تعلقات میں محبت اور خیر خواہی کا اضافہ ہوا؟ کیا وہ نظم وضبط اور اجتماعی ذِمّہ داری کے تقاضوں کو زیادہ بہتر انداز میں ادا کرنے کے لیے تیار ہوئے؟ یہی وہ پیمانے ہیں جن پر اجتماع کے حقیقی ثمرات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اُس کی راہ میں جِدّ وجُہد کرنے والوں کے لیے ہدایت کے راستے کھولنے کا وعدہ فرمایا ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ۶۹) یعنی جو لوگ ہماری راہ میں جِدّ وجُہد کریں گے، ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔ اس وعدے میں اہلِ ایمان کے لیے اُمید بھی ہے اور ذِمّہ داری کا احساس بھی۔ راستے کی تمام تفصیلات ابتدا ہی میں واضح نہ ہوں، تب بھی اخلاص، اطاعت اور ثابت قدمی کے ساتھ سفر جاری رکھنا ضروری ہے۔ قرآن وسنت کی رہنمائی، مسلسل سیکھنے کا عمل اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا منزل کی طرف بڑھنے والوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

اِس موقع پر ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہر رفیق اپنے ایمان، اپنے مقصد، اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعلق اور اپنے نظم وضبط کا جائزہ لے۔ اقامتِ دین کی جِدّ وجُہد محض نعروں سے آگے بڑھ کر مسلسل محنت، کردار کی تعمیر، علمی وفکری پختگی، ایثار اور صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ راستہ آسان نہیں، تاہم اِس کی دشواری اِس کے مقصد کی اہمیت کو کم نہیں کرتی۔ جب افراد اپنی اصلاح کے ساتھ اجتماعی اصلاح کی ذِمّہ داری قبول کرتے ہیں اور منظم جماعت کی صورت میں قرآن وسنت کی رہنمائی کے مطابق آگے بڑھتے ہیں تو اُن کی جِدّ وجُہد محض انفرادی کوششوں کا مجموعہ نہیں رہتی، بلکہ ایک بامقصد اجتماعی عمل بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نومبر ۲۰۲۶ء کا چار مقامات پر منعقد ہونے والا زونل سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی کے تمام رفقاء کے لیے تجدیدِ ایمان، شعورِ مقصد، اخوتِ دینی اور نظم وضبط میں اضافے کا ذریعہ بنے؛ ان کے عزم کو تازگی عطا کرے اور اُنہیں اقامتِ دین کی جِدّ وجُہد میں اخلاص، حکمت، استقامت اور باہمی تعاون کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!



سالانہ اجتماع 2026ء کے حوالے سے

امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ کا پیغام

رفقاءِ تنظیم اسلامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے آپ خیر وعافیت سے ہوں گے۔ تنظیم اسلامی کے سالانہ پلانر کے مطابق نومبر کے مہینے میں تنظیم اسلامی کے کُل پاکستان سالانہ اجتماع کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ گزشتہ سال سیلاب کی وجہ سے ہم مرکزی اجتماع گاہ بہاول پور میں اجتماع منعقد نہ کر سکے تھے اور اب بھی انتظامی معاملات ایسے ہیں کہ وہاں اجتماع منعقد کرنا ممکن نہیں۔ البتہ پاکستان بھر میں زونز کی سطح پر چار مقامات پر ہم یہ اجتماع منعقد کریں گے۔ وسطی پنجاب کے زون کا اجتماع ملتان میں ہوگا' شرقی پنجاب کے زون کا اجتماع لاہور میں ہوگا' کراچی اور بلوچستان کے رفقاء مل کر کراچی میں اجتماع منعقد کریں گے جبکہ ملاکنڈ سمیت' شمالی پاکستان کے رفقاء کا اجتماع پیہونٹ' اسلام آباد میں ہوگا۔ ان شاء اللہ!

تاریخیں آپ تک پہنچ چکی ہیں ۷' ۸ اور ۹ نومبر ۲۰۲۶ء (ہفتہ' اتوار اور پیر)۔ ہفتہ ۷ نومبر نمازِ عصر کے ساتھ اجتماع کا آغاز ہوگا' اتوار ۸ نومبر کو جاری رہے گا اور پیر ۹ نومبر کو نمازِ ظہر سے قبل اِس کا اختتام ہوگا۔ اتوار کو اکثر و بیشتر مقامات پر چھٹی ہوتی ہے اور پیر ۹ نومبر کو سرکاری چھٹی ہے۔ اس لحاظ سے اس مرتبہ تھوڑا آسانی کا معاملہ بھی ہے۔ اِس مختصر پیغام کا مقصد یہ یاددہانی کرانا ہے کہ ہم سب پکا ارادہ کر لیں' اخلاصِ نیت کے ساتھ شرکت کے لیے محنت اور تیاری کریں۔ انتظامی اعتبار سے مرکز کی سطح پر' زونز کی سطح پر' حلقوں' مقامی تناظیم اور اُسروں کی سطح پر ایک ایک رفیق شرکت کے لیے اپنی تیاری ابھی سے شروع کر دے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم دعا بھی کریں: ((رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَ تَمِّمْ بِالْخَیْرِ)) ''اے میرے رب آسانی کا معاملہ فرما' مشکل نہ فرما اور خیر کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔''

اللہ تعالیٰ ہر طرح کے شرور سے ہمیں محفوظ رکھے۔ دنیا کے حالات بڑے خوف ناک ہیں۔

عالمی سطح پر جنگ کے سائے میں ہم نے پچھلی مرتبہ بھی اجتماعات منعقد کیے' اس مرتبہ بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔ ملک بھی انتشار کا شکار ہے۔ اِن حالات میں سچی بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرنے' اللہ کی طرف پلٹنے' اللہ کے دین کی طرف لوٹنے کی زیادہ ضرورت ہے اور یہی ہماری اصل دعوت ہے جس پر ہم نے لبیک بھی کہنا ہے اور لوگوں کو بھی اِس طرف متوجہ کرنا ہے۔

سالانہ اجتماع کے بہت سے فوائد ہیں جن سے مستفید ہونے کا یہ سنہری موقع ہے۔ اِس وقت ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ پکا ارادہ اور تیاری کریں۔ رفقاء اور ذِمّہ داران اپنے مواخاتی بھائیوں کو توجہ دلائیں۔ میری خواہش ہے اور توقع بھی کرتا ہوں کہ اِس مرتبہ بھرپور شرکت ہو۔ ہر رفیق اپنی شرکت کو لازمی بنائے' کوئی انتہائی شرعی مجبوری یا معذوری ہو تو وہ الگ بات ہے۔ ہمارے انتہائی بزرگ رفقاء' صاحب فراش معذور رفقاء یا اللہ نہ کرے کہیں عوارض کا معاملہ ہو تو ایسی صورت میں اُن کی دعائیں ہمارے لیے بڑی قیمتی ہوں گی۔ جن رفقاء کو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے تو وہ ابھی سے تیاری کریں' اپنی مصروفیات کو آگے پیچھے کر کے ہر صورت میں شرکت کو ممکن بنائیں اور اپنی شرکت کے متعلق ذِمّہ داران کو آگاہ بھی کریں۔ اللہ کے دین کی راہ میں نکلنے کا ثواب بھی ہوگا' اِس میں جان' مال' وقت اور صلاحیتوں کا انفاق بھی شامل ہوگا۔ اِس راستے میں جو مشکلیں اور تکالیف آئیں گی اُن کا بھی اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائے گا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ ان شاء اللہ!

اس وقت دنیا کے جو حالات ہیں' اُمّتِ مُسلمہ پر جو آزمائشیں' مصائب اور آلام نازل ہو رہے ہیں' اُن کے متعلق آگاہی حاصل کرنا اور اُن سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔ اپنی دعاؤں میں مجھے اور تمام رفقائے تنظیم کو شامل رکھیں۔ اللہ سے دعا کریں کہ زونل سالانہ اجتماعات خیر و عافیت سے منعقد ہوں اور ہم سب اُن سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

جزاک اللہ خیراً کثیراً والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

سیرتِ رسول اللہ ﷺ: فکری اور عملی اسباق

شجاع الدین شیخ، امیر تنظیم اسلامی

(خطاب: این ای ڈی یونیورسٹی، کراچی)

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم آج کی اس گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ ہمارا موضوع ہے:

Intellectual & Actionable Lessons From Seerah Of Prophet Muhammad ﷺ

اگر سادہ اردو میں کہیں تو ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے فکری اور عملی اعتبارات سے کچھ اسباق کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس موضوع کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہم intellectual lessons پر بات کریں گے اور پانچ باتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں گی، ان شاء اللہ! ان میں غور وفکر کے لیے کچھ مواد بھی ہوگا، ملاحظۂ نفس (self-reflection) بھی ہوگا اور آئندہ کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بھی۔ گفتگو کے دوسرے حصے میں ہم actionable lessons پر بات کریں گے اور ان کی تعداد بھی پانچ ہوگی۔

فکری پہلو

(1) Why are we here in this world?

سادہ سا سوال ہے کہ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں! جواب ہم سب کے پاس ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں، الحمدللہ، لیکن بعض باتوں کی یاددہانی ضروری ہوتی ہے۔

(2) Is humanity my religion or Islam my Deen?

یہ آج کل کافی زیر بحث ہے۔ ہم اس کا تجزیہ کریں گے۔

(3) Destination ahead?

جانا کدھر ہے، منزل کیا ہے؟ اس کا جواب بہت سادہ سا ہے جو ہم سب کے پاس موجود ہے۔

(4) What after finality of prophethood?

رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت کے بعد تو کوئی کتاب نہیں آنی، کوئی رسول نہیں آنے، تو اب کیا ہے؟ اس کا ہمارے عمل سے بھی تعلق ہے لیکن بنیادی طور پر یہ فکری پہلو ہے۔

(5) The best role model?

یقیناً رسول اللہ ﷺ بہترین role model ہیں، لیکن خود احتسابی کے ذریعے اس امر کا جائزہ لیں گے کہ کیا واقعی آج ہمارے معاشرے خاص طور پر ہماری youth کے لیے رسول اللہ ﷺ ہی بہترین نمونہ ہیں!

۱) ہمارا مقصدِ حیات

ہم مسلمان ہیں۔ ہم سب کو پتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کے لیے پیدا کیا۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ ہمیں ہمارا مقصدِ تخلیق یاد رہتا ہے؟ یہاں اِیَّاکَ نَعْبُدُ جسے ہم پنج وقتہ نماز میں دہراتے بھی ہیں، اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے بلکہ عالمی سطح کا بھی جائزہ لیں تو بہت سی عجیب باتیں سامنے آتی ہیں۔ سی این این ایک بڑا نشریاتی ادارہ ہے جسے Ted Turner نے بنایا۔ اس خاندان کی ایک اہم شخصیت نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر تحریر لکھی:

> *Nothing more to be achieved in life, there is no more usage of life.*

اس کے بعد پستول کی گولی سے خودکشی کر لی۔ ہمارا ایمان بتاتا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے لیکن بندے نے ظاہری طور پر یہ لکھا کہ زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہے اور پھر اپنے آپ کو مار ڈالا۔ ایک طالب علم نے بھی کچھ اہداف مقرر کیے ہوتے ہیں۔ مطلوبہ ڈگری مل گئی تو اچھی سی ملازمت کرنی ہے۔ پھر اچھا سا کاروبار کرنا ہے۔ اس کے بعد شادی ہوگی۔ بچے بھی ہوں گے۔ اس قسم کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹارگٹس لوگوں نے سیٹ کیے ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس عمل کے دوران کوئی ہدف حاصل نہ ہو تو خودکشی کر لیتے ہیں۔ رواں سال کا ماہِ رمضان میں نے لاہور میں گزارا۔ رات میں ہم قرآن کا ترجمہ تشریح کے ساتھ بیان کرتے تھے، جیسے ڈاکٹر اسرار احمدؒ تراویح کے ساتھ بیان کرتے رہے۔ دن میں کوئی بارہ کے

قریب یونیورسٹیز میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے بھی یونیورسٹیز کو طلبہ کی ذہنی و روحانی صحت میں بہتری لانے کے حوالے سے کچھ گائیڈ لائنز دی ہیں۔ ان بارہ میں سے چار یونیورسٹیز کے وائس چانسلرز سے میری ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو میں پتا چلا کہ آج کل خودکشی کی سب سے بڑی وجہ breakup ہے۔ یہ لفظ سوشل میڈیا پر نوجوانوں میں بہت عام ہے۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ کوئی صاحب کسی خاتون کی خاطر اپنا مخصوص علمی شعبہ چھوڑ کر انہی کی فیکلٹی میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد باہمی تعلقات توقع کے مطابق نہیں بڑھتے تو ''بریک اپ'' ہوجاتا ہے اور پھر وہ صاحب خودکشی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہمارے معاشرے کے بھی issues ہیں‘ صرف سی این این کے کسی بڑے کا ہی مسئلہ نہیں تھا۔

دیکھنا یہ ہے کہ آیا زندگی ایسے چھوٹے چھوٹے مقاصد ہی سے عبارت ہے؟ نہیں! اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی تہجد کی نماز اتنی طویل ہوتی کہ رات کا ایک تہائی‘ دو تہائی یا نصف حصہ اسی میں گزرتا۔ رمضان کے آخری عشرے میں تو پوری رات کھڑے ہوتے۔ پیروں میں ورم آتا‘ سوجن ہوجاتی۔ پوچھا جاتا کہ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں‘ تو اللہ کے رسول ﷺ فرماتے: ((اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا)) [متفق علیہ] کیا میں اللہ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں! یہ وہ ہستی کہہ رہی ہے جو معصوم ہے۔ ہم سب حضور ﷺ کی شفاعت کے طلب گار ہیں۔ شفاعتِ کبریٰ کا حق آپ ﷺ کو عطا کیا جائے گا۔ ایسے میں ہمیں خود احتسابی کرنی چاہیے کہ آیا ہم اپنے مقصدِ حیات کو یاد رکھے ہوئے ہیں یا نہیں! دنیا میں ہم کسی چھوٹے موٹے کام کے لیے‘ break up کے بعد خود کو ختم کرنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی عبادت کے لیے زمین پر بھیجا۔ اس حوالے سے کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ ہماری تخلیق کی وجہ کیا ہے! صحیح مقصد کے حصول کی راہ میں studies بھی عبادت بن جائیں گی‘ حلال کمانا بھی عبادت بن جائے گا‘ گھر گرہستی کے معاملات چلانا بھی عبادت بن جائے گا۔ یہ بات ہر وقت مستحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بڑے مشن کے ساتھ زمین پر بھیجا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہدایت کی نعمت ہمارے پاس ہے‘ ورنہ چند چھوٹے چھوٹے معاملات پر بندہ زندگی ختم کر لیتا ہے۔ بہت زیادہ دنیاوی دولت حاصل کرنے کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ اب کچھ کرنے کو تو ہے نہیں‘ اس لیے اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ ایک مسلمان کی سوچ ایسی نہیں ہوتی۔ ایک خاندان کے سربراہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنی فیملی کے مستقبل کے لیے کیا طے کیا ہے‘

کیا اہداف طے کیے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ سورۃ الفجر کی آخری دو آیتیں اپنے اور اپنی فیملی کے لیے بطور مقصدِ حیات مقرر کی ہیں:

﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾﴾ (الفجر)

''پس تو داخل ہوجاؤ میرے (نیک) بندوں میں‘ اور داخل ہوجاؤ میری جنّت میں!''

کہ کل اللہ تعالیٰ میرے اور میری فیملی کے لیے اعلان فرما دے کہ داخل ہوجاؤ میرے بندوں میں‘ داخل ہوجاؤ میری جنت میں۔

۲) انسانیت بطور مذہب یا اسلام بطور دین؟

عبدالستار ایدھی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بڑی بڑی تصاویر والے بل بورڈز کراچی میں لگے اور ساتھ ہی یہ جملہ بھی ہمارے ہاں متعارف ہوا: ''میرا مذہب انسانیت ہے۔'' ان کے بعد ایک صاحب جو حیات ہیں‘ ان کے ہاں بھی اسی طرح کا معاملہ ہوا کہ میرا مذہب تو انسانیت ہے‘ اسی کی بات کرنی چاہیے‘ مذہب کیا ہوتا ہے! سوال یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان کیا ہمیں اسلام کو دین ماننے میں کوئی شرم ہے؟ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ دنیا کی کوئی معروف انگریزی لغت دیکھ لیں‘ مذہب کا مفہوم یہی ملے گا کہ یہ تو کچھ عقیدوں کا مجموعہ‘ کچھ مراسمِ عبودیت‘ کچھ خوشی غمی کے تہواروں کی باتیں ہیں۔ البتہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جو آیت نازل ہوئی‘ اس میں فرمایا گیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر اپنے دین کے مکمل ہونے کا اعلان کیا۔ یہ حضور ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ اسلام تو پہلے دن سے چلا آ رہا تھا؛ سورۂ آلِ عمران کے مطابق:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف﴾ (آیت ۱۹)

''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔''

لیکن اس کی تکمیل حضور ﷺ پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل فرما دیا۔''

''انسانیت میرا مذہب ہے'' کا جملہ دین کی تعریف سے ہماری ناواقفیت کی وجہ سے زبان پر آ جاتا ہے ورنہ انسان کو ہم نے خدا نہیں بنانا' معاذ اللہ! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بس انسان خوش ہو جائے' جبکہ درحقیقت یہ حق تو خدا کا ہے کہ اسے راضی کیا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انسان کبھی خوش ہو بھی نہیں سکتے۔ لہٰذا ''انسانیت میرا مذہب ہے'' کی بجائے یہ کہنا چاہیے کہ ''اسلام میرا دین ہے۔''

دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اس ٹریپ میں کیوں آ گئے؟ کیا اسلام بندوں کے لیے نہیں آیا؟ کیا اسلام بطور ایک ضابطہ حیات اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا؟ کیا اللہ کے دیے ہوئے نظام میں مخلوق کا بھلا نہیں ہوگا، فائدہ نہیں ہوگا؟ اس امر میں ہمیں کیا تامل ہے کہ ہم دین کی اور اسلام کی بات کریں؟

یہ ایک بڑا ٹریپ ہے کہ ''انسانیت میرا مذہب ہے'' جبکہ حقیقتاً ایسا قطعاً نہیں ہے۔ ساری مخلوق اللہ کی ہے۔ سارے انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود ایک تقسیم بتائی ہے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ (التغابن:۲)

''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے' پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن۔''

اللہ تعالیٰ نے تم سب کو پیدا کیا۔ تم میں سے کچھ کافر ہیں' کچھ مؤمن ہیں۔ باقی حسن سلوک تو اسلام جانوروں کے ساتھ بھی بتاتا ہے۔ چنانچہ انسانیت میرا مذہب ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اسلام میرا دین ہے۔ مرنے کے بعد جو سوالات قبر میں ہوں گے' ان کی بابت رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ: تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ تمہارے نبی ﷺ کون ہیں؟ کیا آج کل یہ سوالات کہیں پڑھائے جاتے ہیں؟ کبھی اسلامک سٹڈیز میں شاید پڑھائے گئے ہوں۔ ہماری زندگی کے اہم ترین سوالات کسی نیوز بریف میں نہیں آتے۔ کس قدر بڑا ٹریپ ہے کہ اصل سوال سے ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اسلام میرا دین ہے اور اس پر مجھے فخر ہونا چاہیے' نہ کہ میں شرمندہ ہوں یا کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کروں۔ اور یہ خدا تعالیٰ سے detach کرنے کا ٹریپ ہے۔ انسانیت کی فکر کرو جبکہ انسانیت کے خالق کو بھلا دو۔ خالق نے دین بندوں کے لیے ہی تو عطا کیا ہے۔ خالق کے حکم پر جب عمل ہوگا تو بندوں کے ساتھ بھلا سلوک ہی دکھائی دے گا۔ اس کی بہترین مثال محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''یقیناً رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔''

۳) منزل کیا ہے؟

ہم سب کو پتہ ہے کہ کدھر جانا ہے۔ کسی مسلمان کے انتقال پر ہم پڑھتے ہیں: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ! بے شک ہم بھی اللہ کے ہیں اور ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جملے میں متوفی کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ تو ڈرانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جی بالکل ڈرایا جاتا ہے۔ آپ لوگوں کو passing marks کے حوالے سے ڈرایا جاتا ہے کہ مقررہ فیصد سے کم لینے پر کیا ہوگا! یہ ڈرانا آپ کے بھلے کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنم سے ڈرایا ہے کہ نہیں؟ اگر وہ رحمٰن ورحیم ذات ڈراتی ہے تو اس میں ہمارے ہی بھلے کی بات ہے۔ میری چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی آڈٹ لائف گزری ہے۔ اس میں مجھے غور وفکر اور تدبر کے لیے بڑا اچھا پوائنٹ ملا۔ آج اگر ایک ایکسٹرنل آڈیٹر آئے اور گزشتہ سال کی میری ریسرچ ہسٹری کا آڈٹ کرے تو جو رپورٹ بنے گی وہ کیا نکلے گی؟ بس میں اپنا سوچ لوں' آپ اپنا سوچ لیں' اس سے پہلے کہ کوئی ہمارا آڈٹ کرے' ہمیں خود اپنا آڈٹ کر لینا چاہیے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے:

حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا [مسند الفاروق ۶۱۸/۲]

اپنا محاسبہ خود کر لو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کل تمہاری accountability کی جائے۔ ہمارے دائیں اور بائیں طرف کراماً کاتبین موجود ہیں۔ اردو کی ضرب المثل ہے کہ ''آنکھوں دیکھا جانا' کانوں سنا نہ ماننا''۔ البتہ دونوں فرشتے نظر نہیں آتے۔ اب ایک اور دلچسپ بات کہ میرا اور آپ کا ایمان seen سے شروع نہیں ہوتا بلکہ unseen سے شروع ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرۃ:۳) ''غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔''

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جو نظر آ رہا ہے یہ حقیقت میں اصل نہیں ہے۔ جو اس کے بعد ہے' وہ اصل ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لوگو! آج تم سو رہے ہو' جب موت آئے گی تب تم جاگو گے۔'' تب اصل حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آئے گی۔ چنانچہ ہماری منزل آخرت

ہے۔ ہم کہتے تو ہیں کہ آخرت ہماری منزل ہے‘ لیکن کیا واقعی ایسا سمجھتے بھی ہیں؟ کیا واقعی ہم جنت میں جانا چاہتے ہیں؟ چار سال کی ڈگری جان لگانے کے بعد ملتی ہے۔ چند لاکھ کی تنخواہ جان کھپانے کے بعد ملتی ہے۔ کیا اللہ کی جنت اتنی سستی ہے کہ بغیر کچھ کیے مل جائے گی؟

۴) ختمِ نبوت کے بعد کیا؟

ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر آ کر نبوت ختم ہوگئی۔ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ انبیاء و رسل علیہم السلام لوگوں کی رہنمائی کے لیے آتے تھے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا کہ پچھلی آسمانی ہدایت distortion کا شکار ہو جاتی تھی تو نئی تعلیم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک اور ذرا گہرا پوائنٹ یہ ہے کہ سماجی حوالے سے انسان کا ارتقا ہو رہا تھا۔ غار کی زندگی سادہ تھی۔ پھر چھوٹی چھوٹی بستیاں‘ بڑے شہر‘ اور ریاستوں کے معاملات پیش آئے۔ جیسے جیسے انسانی ارتقاء آگے بڑھتا رہا‘ نئی تعلیم آتی رہی۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس وقت ذرائع ابلاغ دستیاب تھے۔ جدہ کے ساحل پر مختلف ممالک سے جہاز آ کر لگتے تھے۔ اتنے ذرائع ابلاغ دستیاب تھے کہ پوری دنیا میں رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری کلام قرآن مجید کی صورت میں عطا کر دیا جبکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی۔ اب کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں۔ دین مکمل ہونے کا اعلان ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں انسان socially evolve ہو کر ریاستوں کی سطح پر پہنچ گیا تھا۔ آج بھی دنیا میں ریاستوں کا تصور موجود ہے۔ اگلا مرحلہ گلوبل ریاست کا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے پہلے رسول لوگوں کی راہنمائی کے لیے آتے تھے تو آج لوگوں کو گائیڈنس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کون دے گا؟ قرآن دے گا۔ پہنچائے گا کون؟ ہم نے پہنچانا ہے۔ آج ہم the chosen ones ہیں۔ یہ الفاظ یہودی آج بھی اپنے لیے استعمال کرتے ہیں مگر غلط وقت استعمال کر رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ (البقرۃ)

’’میں نے تمہیں (اُس وقت کے) جہان والوں پر فضیلت دی۔‘‘

اُس وقت تو صحیح تھا۔ اب رسول اللہ ﷺ کے آخری رسول بنائے جانے کے بعد ان پر تو اللہ کی طرف سے لعنت ہوئی۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۲ میں ارشاد ہوا

کہ ان پر لعنت کی گئی اور ان پر ذلت اور محتاجی تھوپ دی گئی۔

اب اگر ایک غیر مسلم مسلمانوں کے ذاتی کردار‘ ہمارے روز مرہ کے معاملات اور معمولات کو دیکھے تو وہ کس نتیجے پر پہنچے گا؟ بقول علامہ اقبال: ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

۵) بہترین کردار کا نمونہ؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

’’تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔‘‘

ہم کیا‘ یہ حقیقت بہت سے غیر مسلم بھی مانتے ہیں۔ جب گاندھی جی نے جیل میں مولانا شبلی نعمانیؒ کی کتاب ’’سیرت النبی ﷺ‘‘ پڑھی تو کہا: ’’(حضرت) محمد (ﷺ) کی عظمت کا قائل ہونے کے لیے مجھے کچھ اور پڑھنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ کانگریس کے امیدواروں نے جب ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تو گاندھی نے کہا: ’’گورننس کے لیے میرے پاس تمہارے سامنے (حضرات) ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے سوا کسی اور کی مثال نہیں۔‘‘ اسی طرح ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب The Hundred میں حضرت محمد ﷺ کو نمبر ایک پر رکھا۔ یہ تو بندوں کی مجبوری ہے کہ مانیں‘ رسول اللہ ﷺ کو کوئی ضرورت نہیں ان کے استناد کی۔ مائیکل ہارٹ نے بھی گڑبڑ یہ کی کہ کہا: He is the only person in history۔ یعنی بطور ایک شخصیت مانا ہے‘ رسول نہیں مانا۔

ہمارے لیے غور و فکر کے لیے کیا مواد ہے؟ ہمارے بچے کیا‘ ہماری عورتیں بھی روئی ہیں اور ہمارے بڑے بھی جب رونالڈو FIFA کے ورلڈ کپ سے آؤٹ ہوا۔ پھر Messi کو پکڑ لیا گیا۔ وہ بھی ہار گیا تو ہمارے بچے روئے‘ ہماری بچیاں روئیں‘ ہمارے مرد روئے‘ ہماری عورتیں روئیں۔ آج ہمارے یہ رول ماڈلز ہیں۔ یہ ہیروز ہیں آج ہمارے۔ پہلے ہم کہتے تھے حجام کی دکان‘ آج انگلش میں کہتے ہیں سیلون‘ اس کے باہر تصاویر کس کی لگی ہیں؟ ماڈلز کی اور مشرک اداکاروں کی۔ دلہنیں بیوٹی پارلر میں تیار ہوتی ہیں۔ وہاں اداکاراؤں کی تصویریں لگی

ہوتی ہیں کہ ان جیسا بنا دیا جائے۔ اب ہم دوبارہ اپنے آپ سے پوچھیں کیا واقعی حضرت محمد ﷺ ہمارے لیے بہترین رول ماڈل ہیں۔ اُمت کی عورتوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کا رول ماڈل ازواج مطہرات کے ذریعے‘ رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹیوں کے ذریعے مکمل ہوگا۔ کیا آج ہماری اُمت کی عورتوں کے لیے سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ ایک رول ماڈل ہیں؟ سیدہ فاطمۃ الزہرا ؓ کی حیا آج ہماری قوم کی بیٹیوں کے لیے ایک رول ماڈل ہے؟ حضرت فاطمۃ الزہرا ؓ نے فرمایا تھا: ’’جب میرا انتقال ہو تو میرا جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھانا۔‘‘ مرد کے کفن کے کپڑے تین ہوتے ہیں لیکن عورت کے کفن کے کپڑے پانچ ہوتے ہیں۔ یہ میری گفتگو کا تقریباً ۶۰ فیصد مکمل ہوا‘ جو پہلا حصہ تھا۔

عملی پہلو

گفتگو کے دوسرے حصے میں بھی پانچ باتیں پہلے لسٹ ڈاؤن کر لیتے ہیں۔ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ آپ تو بالکل وعظ کی بات کر رہے ہیں۔ جی بالکل‘ ہمیں وعظ ہی کی بات کرنی ہے۔ وعظ عربی زبان کا لفظ ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے لیے خود وعظ کا لفظ استعمال کیا۔ وعظ کا اردو میں اگر ترجمہ کریں تو بنتا ہے: ’’وہ بات جو دل کو نرم کر دے۔‘‘

(1) Relation with Allah *(2) Relation with Quran*

(3) Social responsibility

دین ہمیں سوشلائزیشن کے بارے میں بھی بہت کچھ بتاتا ہے‘ لیکن ہماری لاعلمی کی وجہ سے لگتا ہے کہ شاید یہ دوسروں سے ملا ہے۔

(4) Guarding the senses

اپنے حواس کی حفاظت: آج ہم جہاں کھڑے ہیں‘ ہم سب کو پتہ ہے کہ دنیا پریشان ہے۔ ایلون مسک سے کہا جا رہا ہے کہ AI کی سپیڈ کو سلو کروا دو۔ اس پر بات کریں گے‘ ان شاء اللہ۔

(5) Role as member of Ummah

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑے کام کے لیے پیدا کیا ہے۔

۱) تعلق مع اللہ

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں فرمایا: ’’جس کسی نے بھی

مجھ پر کوئی احسان کیا‘ میں نے اس کے احسان کا بدلہ چکایا ہے سوائے ابوبکر کے۔‘‘ اللہ اکبر! رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ صدیق اکبر ؓ کے بارے میں تحسین آمیز الفاظ ہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’اگر میں کسی کو واقعتاً دوست (خلیل) بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔‘‘ البتہ نہیں بنایا بلکہ اللہ تعالیٰ کو بنایا ہے۔ جب حضور ﷺ کی زندگی کے آخری لمحات تھے اور آپؐ پر ایک کیفیت طاری ہوئی اسے دیکھ کر سیدہ فاطمۃ الزہرا ؓ روئی ہیں۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد تمہارے والد کو کوئی تکلیف نہیں‘ تمہارے والد اپنے رب سے ملاقات کو جا رہے ہیں۔ یہ آخری بیان ہے جو اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جاری ہوا۔ یہ اللہ کے ساتھ تعلق کا کلائمکس ہے۔ اللّٰھمَّ الرفیق الاعلیٰ! بل الرفیق الاعلی! اس کے کئی مفاہیم بیان کیے گئے۔

ہم اپنی تنہائی میں غور کریں کہ اللہ کے بارے میں ہم کتنا جانتے ہیں۔ کیا ہم واقعی اللہ کو پہچانتے ہیں؟ اللہ کی محبت میں کبھی روئے ہیں؟ آنسو خوشی کے بھی نکلتے ہیں۔ وہ رونا غم میں نہیں ہوتا جو رونا خوشی میں ہوتا ہے۔ ایک رات اللہ کے رسول ﷺ کو سورۂ آل عمران کی آخری آیات عطا ہوئیں‘ جس میں دعائیں ہیں۔ حضور ﷺ پوری رات روئے۔ مفسرین نے کہا یہ رونا خوشی کے مارے تھا۔ اتنا بڑا خزانہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ اللہ کی نعمتوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رونا اور اپنی تنہائی میں اللہ سے باتیں کرنے کے لیے کتنا وقت ہے ہمارے پاس؟ یہ فکر رہتی ہے کہ میرا فلاں دوست یا رشتہ دار ناراض نہ ہو جائے‘ کتنی مرتبہ یاد رہتا ہے کہ اللہ ناراض نہ ہو جائے؟ سیاست دان کہتے ہیں ہماری ریڈ لائن، اسٹیبلشمنٹ کہتی ہے ہماری ریڈ لائن، گھر والے کہتے ہیں ہماری ریڈ لائن۔ اللہ تعالیٰ کی بھی کوئی ریڈ لائن ہے جسے دھڑلے کے ساتھ توڑے جا رہے ہوں؟ اللہ کے رسول ﷺ راتوں کو کھڑے ہو کر اللہ سے راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں‘ اللہ سے لو لگا رہے ہیں۔ اس کا کچھ تو عکس ہماری زندگی میں ہونا چاہیے کہ اللہ میرے لیے ترجیح اول ہے یا نہیں! اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے!

۲) قرآن کے ساتھ تعلق

اس حوالے سے میں عام طور پر چھ سوالات رکھتا ہوں۔ سوشل میڈیا پر بھی آپ کو یہ مل جائیں گے۔

i) آخری بار قرآن کی تلاوت خود سے اپنے لیے کب کی تھی؟

ii) قرآن پاک کی تلاوت کی تکمیل کب کی تھی؟

iii) قرآن کو سمجھ کر کب پڑھا تھا؟ یعنی ترجمہ‘ تشریح‘ audio/visual‘ قرآن کی کوئی محفل۔

iv) قرآن کو ترجمہ کے ساتھ کب کھولا تھا؟

v) قرآن تفسیر کے ساتھ کب کھولا تھا؟ کتاب کی شکل میں‘ آڈیو/ویڈیو؟

vi) قرآن کی تشریح کے ساتھ کب تکمیل کی؟

میں نے چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی تعلیم ۲۰۰۱ء میں کلوز کر دی تھی۔ اس کے بعد کبھی پلٹ کر اس کی کتاب کھول کر نہیں دیکھی۔ وہ کتابیں بھی outdated ہو گئیں۔ اسی طرح کل آپ لوگ پاس آؤٹ ہو کر اپنی فیلڈز میں چلے جائیں گے۔ سارا نصاب پرانا ہو جائے گا۔ قرآن جیسا کلام بھی کوئی ہوگا؟ ہماری زندگی کا اہم ترین نصاب یہی ہے۔ فجر میں قرآن‘ ظہر میں قرآن‘ عصر میں قرآن‘ مغرب میں قرآن‘ عشاء میں قرآن۔ یہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا۔ چھ سال کے بچے کے لیے قرآن‘ ۱۰۰ برس کے بوڑھے کے لیے قرآن‘ امام کعبہ کے لیے قرآن‘ عام آدمی کے لیے قرآن‘ دنیا کے کسی بھی علاقے میں بسنے والے مسلمان کے لیے قرآن۔ ہماری زندگی میں اس قرآن کی کیا قدر و منزلت ہے؟ اس قرآن کی کیا fixation ہے ہمارے معمولات میں؟ مشہور مفکّر برنارڈ شا کہتا ہے:

"I read the Holy Quran. There is no better book than the Holy Quran in the world. But when I see the Muslims there is no worst the nation than the Muslims in the world."

"میں قرآن پڑھتا ہوں۔ دنیا میں اس سے بہترین کوئی کتاب نہیں‘ لیکن جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو دنیا میں ان سے بدترین کوئی قوم نہیں۔"

آپ نے کل ہی یا آج ہی قرآن پاک کھولا‘ بہت اچھی بات! کچھ تلاوت کر رہے ہیں‘ بہت اچھی بات۔ ترجمہ نہیں پڑھ رہے تو پڑھ لو بھائی! اب تو HEC بھی پڑھوا رہا ہے۔ تو پڑھ لو بھائی! ہمیں تو اضافی کلاسز لینا پڑیں۔ یا ہمارے اساتذہ نے سمجھا دیا۔ آپ کو تو یونیورسٹی میں رہ کر پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ پڑھ لو بھائی! اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ دنیا کا بہترین علم جو ربّ تعالیٰ نے دیا ہے‘ وہ ہمارے پاس نہ ہو تو یہ سوالیہ نشان ہے۔ اگر ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ایک

آیت کے سمجھنے پر ۱۰۰ نفل سے زیادہ کا اجر بھی ملتا ہے۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا۔

۳) معاشرتی ذمہ داری

سوشل ویلفیئر یا خدمتِ خلق کے تصور کو بھی مغرب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہم اپنی بنیادوں پر کھڑے ہونے کو تیار کیوں نہیں۔ غور کریں پچھلے ۱۰۰ برس میں سب سے زیادہ لاشیں کس کی گریں؟ مسلمانوں کی۔ پچھلے سو برس میں سب سے زیادہ کن ملکوں پر قبضہ ہوا؟ مسلمانوں کے۔ پچھلے ۱۰۰ برس میں ایک کروڑ سے زیادہ بندوں کی ہجرت کن لوگوں کی ہوئی؟ مسلمانوں کی۔ ۷۰ لاکھ شام سے ترکیہ گئے ہیں‘ تین ساڑھے تین لاکھ افغانستان سے ہمارے ہاں آئے۔ باقی کو چھوڑ دیں۔ ان ایک کروڑ سے زیادہ کو کس نے host کیا؟ مسلمانوں نے۔ اس سب کے بعد بھی کہا یہ جائے کہ ہمیں سوشل ویلفیئر کو سیکھنا پڑے گا۔ استغفر اللہ!

اس حوالے سے ہمارا دین کیا بتاتا ہے؟ کیا میں اپنے والد کو زکوٰۃ دے سکتا ہوں؟ نہیں! اپنی اولاد کو دے سکتا ہوں؟ نہیں! اپنی بیوی کو دے سکتا ہوں؟ نہیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میری ذمہ داری ہیں۔ مجھے ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ پھر باقی لوگ آئیں گے‘ بہن بھائی وغیرہ۔ اگر وہ مستحق ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا نظام دیا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں حدیث قدسی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: يَا ابْنَ آدَمَ، مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ اَعُودُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ: اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِي فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ؟ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ؟))

((يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، وَكَيْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ: اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلَانٌ، فَلَمْ تُطْعِمْهُ؟ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِي))

((يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ اَسْقِيكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟ قَالَ: اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهِ، اَمَا اِنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ وَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِي))

"بے شک اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا: اے ابنِ آدم! میں بیمار ہوا تو نے

میری عیادت (بیمار پرسی) نہیں کی۔ بندہ کہے گا: اے میرے رب! میں تیری عیادت کیسے کرتا جبکہ تو ربُّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی تھی؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اُس کے پاس پاتا؟

اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا' تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا جبکہ تو ربُّ العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا تھا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کا ثواب میرے پاس پاتا؟

اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے پانی پلاتا جبکہ تو ربُّ العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا اور تو نے اسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو اس کا ثواب میرے پاس پاتا۔''

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ کے مطابق پیاسے کتے کو پانی پلانے پر ایک عورت کی مغفرت ہو رہی ہے جبکہ بلی کو ایک عورت نے باندھ کر رکھا اور وہ مر گئی تو اُس کو عذاب دیا گیا اُس بلی کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے۔ جو رسول ﷺ ہمیں بتا رہے ہیں' ہمیں کہیں اور سے لینے کی ضرورت ہے؟ کیا ہم اتنے غلام ہو گئے دوسروں سے سیکھنے کے چکر میں؟ پھر حقوق العباد کے ذیل میں ماں باپ کو دیکھنے کا اجر حج کا ثواب ہے۔ وہ حلال لقمہ جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو' یہ بھی صدقہ کا عمل ہے۔ حقوق العباد کے حوالے سے ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے بتایا ہے اور اس کو جنت' جہنم سے جوڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی رو سے اس اُمت کا مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو بلکہ وہ ہے جس کے پاس نماز' روزہ' زکوٰۃ کے ڈھیر ہوں گے لیکن وہ آخرت میں جھوٹ' غیبت' مار دھاڑ' مال ہڑپ کرنے جیسی کوتاہیوں کے ساتھ آئے گا۔ کل exchange کے لیے کیا ہوگا؟ پیسہ یا اعمال؟ اس سے بڑا خدمتِ خلق کا تصور کہیں اور ملے گا؟

۴) حواس کی حفاظت

اپنی آنکھ، اپنی زبان، اپنے کان، اپنے دل، اپنے ہاتھ، اپنے پیر سب کی حفاظت اللہ کے رسول ﷺ نے بتائی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حیا ایسی تھی کہ ایک کنواری پردہ کرنے والی لڑکی

سے زیادہ حیا کرنے والے تھے۔ اللہ اکبر! اور آج ہم کیا دیکھتے ہیں: ع ''حمیت نام تھا جس کا' گئی تیمور کے گھر سے۔'' آج ہماری وہ بہنیں بیٹیاں جو حجاب کرتی ہیں' یہ ایک بڑا جہاد ہے۔ اسلام میں صرف لڑکیوں یا عورتوں کو نہیں بلکہ مردوں کو بھی نگاہوں کی حفاظت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے کہ بری نگاہ شیطان کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''حیا اور ایمان دونوں ساتھی ہیں' اگر ایک چلا جائے تو دوسرا بھی چلا جائے گا۔''

۵) اُمّتی ہونے کا تقاضا

ہم وہ لوگ نہیں ہیں کہ کھا لیا' پی لیا' موج کر لی۔ بے مقصد زندگی تو جانور کی ہوتی ہے۔ انسان تو ایک بڑی مخلوق ہے۔ انسانوں میں سے بھی ہم مسلمان ہیں آخری پیغمبر ﷺ کے اُمتی ہیں۔ اس حوالے سے ہم سے تو بڑا تقاضا ہے۔ آپ نے جو بھی راستہ چنا ہے' اپنی تعلیم پوری کریں۔ اپنے کریئر کو pursue کریں۔ بس یہ دیکھیں ہماری اصل ذمہ داریاں کیا ہیں۔ آج میرے پاس جو علمی صلاحیت ہے' ذہنی رسوخ' پیشہ ورانہ مہارت ہے' اس کا بہترین استعمال کیا ہو گا؟ ہم سب مانتے ہیں کہ دُنیا کی افضل ترین ہستی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپؐ کا خون اس پوری کائنات میں سب سے قیمتی ہے۔ وہ طائف میں بہا ہے' اُحد میں بہا ہے۔ ہم ان کے اُمتی ہیں تو ختم نبوت کے بعد اب میری صلاحیتوں کا بہترین مصرف وہ ہوگا جو اس کام کے لیے لگے۔ اس کے لیے کوشش کریں۔ غور کریں کیا آج ہم اُمّت کے درد کو محسوس کرتے ہیں؟ آج ہمارا رونا ہے شرٹ سیون والے رونالڈو کے ہارنے پر مگر فلسطین میں چالیس ہزار بچہ شہید کر دیا گیا ہے جسے ہم بھول گئے۔ کراچی کے کچھ علاقوں میں آج بھی بچے لائن لگا کر برتنوں میں پانی بھر کر لے جاتے ہیں۔ کیا ہم یہ درد محسوس کرتے ہیں؟ کچھ سوچ ہے ہمارے پاس؟ NED کے گریجوایٹس نے دنیا کو serve کیا ہے' آپ نے پوری اُمّت کو serve کرنا ہے' ان شاء اللہ! جتنا بڑا سوچیں گے' اللہ تعالیٰ اتنا نوازے گا۔ جو آخرت کا سوچے گا' اس کے لیے اللہ تعالیٰ یہ دنیا ذلیل کر کے اس کے قدموں میں ڈالے گا۔ جب ہم اللہ کے دین کے کام میں لگیں گے تو اللہ ہمارے لیے کافی ہو جائے گا' ان شاء اللہ! اللہ پھر وہ دے گا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین oo

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۱۳)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیت ۳۴ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۡ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا‘ اور ہو گیا وہ کافروں میں سے۔‘‘ (یا ’’اور تھا وہ کافروں میں سے۔‘‘)

کَانَ یہاں ناقصہ بھی ہو سکتا ہے اور تامہ بھی۔ چنانچہ یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ ’’وہ ہو گیا کافروں میں سے۔‘‘ یعنی اپنے اس فعل کی وجہ سے‘ اپنی اس نافرمانی کی وجہ سے‘ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ’’وہ تھا ہی کافروں میں سے۔‘‘ اُس کے اندر جو شیطنت چھپی ہوئی تھی‘ صرف اس آزمائش کے ذریعے اُس کا ظہور ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی کسی کے اندر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے تو مخفی نہیں ہوتا‘ اُس کے علم میں ہوتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوا: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور اللہ ظاہر کر کے رہے گا سچے اہلِ ایمان کو بھی اور ظاہر کر کے رہے گا منافقین کو بھی۔‘‘ ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ﴾ کا ترجمہ ’’اللہ جان کر رہے گا‘‘ نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے تو علم میں سب کچھ ہے‘ البتہ اللہ ظاہر کر دے گا۔ اسی طرح ابلیس کی چھپی ہوئی شیطنت‘ تکبر‘ استکبار‘ گھمنڈ اور اس کا شر سب ظاہر ہو گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے‘ اُن کے سامنے جھک جانے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ ابلیس تو جنّات میں سے تھا‘ وہ اس حکم کا مخاطب کیوں کر بنا؟ اس بارے میں ایک

رائے تو یہ ہے کہ جنّات ملائکہ سے کم تر مخلوق ہیں جبکہ ملائکہ ان سے بلند تر مخلوق ہیں۔ جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ سب کے سب آدم کو سجدہ کرو تو تابع ہونے کے اعتبار سے جنّات بھی گویا بر سبیلِ تغلیب اس حکم کے مخاطب تھے‘ چنانچہ اس پہلو سے ابلیس بھی اس کا مخاطب تھا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ابلیس اپنے خاص علم‘ زہد اور عبادت گزاری کی وجہ سے ملائکہ کے ساتھ اس درجہ قرب رکھتا تھا کہ گویا اُن کے زمرے میں شریک ہو چکا ہو‘ اس لیے خاص طور پر وہ شخصاً اس حکم کا مخاطب تھا جو حکم فرشتوں کو دیا گیا۔ بہرحال یہ ساری چیزیں احتمالات کے درجے میں ہیں۔

آدم اور ابلیس کے ناموں کی بنیاد

آدم کے بارے میں کثرت کے ساتھ مقبول رائے یہ ہے کہ چونکہ ان کی پیدائش ادیم الارض (crust of the earth) سے ہوئی‘ اس لیے مادّۂ تخلیق کی مناسبت سے انہیں آدم کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا رنگ سرخی مائل گندمی تھا جس کے لیے عربی میں لفظ ’’ادمۃ‘‘ مستعمل ہے۔ ایک تیسری رائے یہ ہے کہ ’’اَدِمَ‘‘ کا مفہوم ہے: دو افراد کے درمیان الفت و اتفاق پیدا کرنا‘ باہم ملنا جلنا‘ چیزوں کا آپس میں مختلط ہو جانا۔ جیسے انسان کا مادّہ ’’انس‘‘ ہے اور اسے انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں‘ اسی طرح ’’آدم‘‘ کے لیے بھی ’’ادم‘‘ مادہ میں ایک لفظی بنیاد موجود ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ایک خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں‘ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((انظُرْ إليها فإنه أحرى أن يُؤدَمَ بينكما)) [السلسلة الصحيحة ۱/۱۹۸] یعنی تم اُسے ایک نظر دیکھ لینا‘ اس لیے کہ اس سے زیادہ توقع ہے کہ تمہارے درمیان موافقت اور محبت پیدا ہو جائے اور تم آپس میں زیادہ گھل مل سکو۔ چنانچہ شاید ’’ادم‘‘ کے اس معنی و مفہوم کے اعتبار سے آدم کو آدم کہا گیا۔ انگریزی میں انسان کو gregorius animal‘ مل جل کر رہنے والا‘ متمدّن حیوان کہا جاتا ہے۔

’’ابلیس‘‘ کا اصل نام (اسمِ علَم) قرآن مجید میں نہیں آیا۔ بعض روایات میں اس کا

نام ''عزازیل'' آیا ہے۔ ابلیس اس کا صفاتی نام ہے‘ اس لیے کہ اَبْلَسَ یُبْلِسُ کا معنی ہے نہایت مایوس ہو جانا۔ چنانچہ ابلیس وہ شخصیت ہے جو انتہائی مایوس ہو جائے‘ جسے کوئی امید نہ رہے (The frustrated one)۔ اب چونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے حضور تکبر کا اظہار کیا اور اُس کے حکم سے سرتابی کی تو وہ راندۂ درگاہ ہوا اور اُسے ذلیل و رسوا کر کے وہاں سے نکال دیا گیا تو اب اسے اپنے بارے میں خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس کی سرکشی پر اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ﴾ (الاعراف:۱۸) ''پس نکل جاؤ یہاں سے بُرے حال میں مردود ہو کر۔'' سورۃ الحجر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۳۴ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳۵﴾ ''بس نکل جاؤ اس میں سے‘ تم یقیناً مردود ہو چکے ہو۔ اور یقیناً تم پر لعنت رہے گی روزِ جزا تک۔'' سورۂ صٓ میں بھی تقریباً یہی الفاظ آئے ہیں۔

ابلیس کے انکار کا سبب

قرآن حکیم میں چھ مزید مقامات پر یہ واقعہ مذکور ہے۔ یہاں تو صرف ایک آیت میں اس کا لبِ لباب بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ حقیقت معلوم ہو جائے کہ ابلیس انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس مقام پر صرف ایک لفظ آیا ہے: ﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ ''اُس نے انکار کیا اور استکبار کیا'' لیکن دوسرے مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲﴾ (الاعراف:۱۲، صٓ:۷۶) ''مَیں اِس سے بہتر ہوں (برتر ہوں‘ اعلیٰ ہوں‘ افضل ہوں) مجھے تُو نے آگ سے بنایا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے!'' ﴿ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝۶۱﴾ (الاسراء) ''کیا مَیں اُس کو سجدہ کروں جس کو تُو نے مٹی اور گارے سے بنایا ہے؟'' گویا کہ ایک حقارت آمیز انداز میں حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ کیا۔ تو یہ اُس کا گھمنڈ اور تکبر یا عُجب تھا۔ حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے: ((ثَلاثٌ مُهْلِكاتٌ وَثلاثٌ مُنْجِيَاتٌ)) ''تین چیزیں (انسان کو) ہلاک کرنے والی ہیں اور تین چیزیں نجات دینے والی ہیں۔'' ((فأمّا الْمُهلِكاتُ: فشُحٌّ مُطاعٌ، و هَوًى مُتَّبَعٌ، و إعجابُ الْمَرْءِ بنفْسِهِ)) [صحیح الجامع:۳۰۴۵] ''پس ہلاک کرنے والی

چیزیں تو یہ ہیں: بخل جس کی پیروی کی جائے‘ خواہشِ نفس جس کے پیچھے چلا جائے‘ اور انسان کے اندر اپنی برتری کا احساس پیدا ہو جائے۔'' انسان میں گھمنڈ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس آخری چیز کے بارے میں فرمایا: ((وَهِيَ اَشَدُّهُنَّ)) ''اور یہ تمام مہلکات میں سب سے شدید ہے۔'' انسان کو ہلاک کرنے کے لیے سب سے مؤثر شے‘ اس کی تباہی و بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ اِعجاب (اپنی برتری کا احساس) ہے۔ ابلیس میں یہ احساسِ برتری پیدا ہوا اور اسی گھمنڈ اور تکبر کی وجہ سے اُس میں اس درجہ سرکشی پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

حکمِ سجدہ کی علّت

یہ سب واقعات کس طرح اور کس ماحول میں ظہور پذیر ہوئے‘ ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ یہ چیزیں متشابہات میں سے ہیں‘ اور آیاتِ متشابہات کی تاویل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''حالانکہ ان آیات کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' چنانچہ ہم یہ تصور تو نہیں کر سکتے کہ کوئی بہت بڑی جگہ ہو جہاں تمام فرشتے جمع ہوں‘ حضرت آدم علیہ السلام بھی وہاں موجود ہوں اور (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ سب کے سامنے اس محفل میں صدارت فرما رہے ہوں‘ اور پھر وہاں حکم دیا جا رہا ہو کہ سب آدم کو سجدہ کرو! یہ تو عالَمِ غیب کی باتیں ہیں۔ یہ بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی یہ معلوم ہوا یا نہیں کہ مجھے سجدہ کرایا گیا ہے! اس لیے کہ بعد میں اُن سے جو خطا ہوئی اور اس کے بارے میں ابلیس نے جس طریقے سے اُنہیں ورغلایا کہ یہ جو تمہیں درخت کا پھل کھانے سے روکا گیا ہے وہ اس لیے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ ﴿اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ﴾ یہ بات منطقی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو اس کا شعور اور علم ہوتا کہ مَیں تو فرشتوں سے افضل ہوں‘ فرشتے تو میرے سامنے سربسجود ہوئے ہیں تو اس اعتبار سے یہ بات کوئی دلیل اور وسوسہ اندازی کے لیے کوئی بنیاد نہیں بن سکتی تھی کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ! درحقیقت فرشتوں کو جو حکم دیا گیا اور وہ سب کے سب حضرت آدمؑ کے سامنے جھک گئے‘ انہوں نے سجدہ کیا‘ اس کی اصل تعبیر (connotation) خلافت کے

ساتھ متعلق ہے۔

اس خلافت کا منطقی نتیجہ تھا کہ تمام فرشتے یا کارکنانِ قضاوقدر‘ جُنُودٌ مُجَنَّدَة‘ جن کی تعداد کسی کو معلوم نہیں ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ (المدثر:۳۱) ان سب کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کر دیا گیا ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝﴾۔ ہمارے یہاں آزادی سے پہلے حکومت برطانیہ کی جانب سے جب کسی کو وائسرائے ہند بنا کر بھیجا جاتا تھا تو یہاں کے سارے کارکنانِ حکومت اُس کی اطاعت کے پابند ہوتے تھے۔ اس معنی میں جب حضرت آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی تو کائنات کی مخفی حکومت کی تمام سول سروس کو ان کا تابع فرمان کر دیا گیا۔ اس کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذُریت کو خلافتِ ارضی عطا فرما رہا ہے‘ قوتِ تسخیر عطا فرما رہا ہے‘ تو اللہ تعالیٰ کی اس عالمی و تکوینی سلطنت کے تمام کارکن اور ان کی سول سروس اگر حضرت آدم علیہ السلام کا حکم نہ مانیں تو وہ یہاں ایک قدم نہیں چل سکتے۔ ہمیں ارادے کی جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے‘ یہ اُس کا تقاضا ہے۔ مَیں کسی خیر کے کام کی طرف چلنا چاہتا ہوں تو نامعلوم کتنی فورسز آف دی نیچر ہیں جو اس راستے سے متعلق ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اوپر فرشتے مامور ہیں۔ اگر قدم قدم پر فرشتے میرے لیے رکاوٹ بن جائیں اور میرا راستہ روک دیں تو میں اپنے کسی ارادے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب خلافت دی گئی اور تسخیرِ کائنات کی صلاحیت ان میں رکھ دی گئی تو بلاستثناء کُل ملائکہ کو ان کے آگے سربسجود کر دیا گیا۔ گویا اللہ کے حکم سے تمام فرشتے اس اعتبار سے انسان کے مطیع بنا دیے گئے کہ یہ اپنے ارادہ و اختیار سے جس راستے پر بھی بڑھنا چاہے تو راستہ کھلا رکھنا ہے۔ جدھر جانا چاہے‘ جائے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ جب انسان سے حساب لے گا اس کے اچھے بُرے کاموں کا نتیجہ نکلے گا۔ اِس وقت اللہ نے آزادی دی ہے کہ ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ (الدھر) البتہ جب وقت آئے گا تو یہی فرشتے اسے ہتھکڑیاں لگائیں گے‘ بیڑیاں ڈالیں گے۔ یہی ہوں گے جو لوگوں کو گھسیٹ کر اُوندھے منہ جہنم میں جھونکیں گے۔ اِس وقت حضرت آدمؑ کو

خلافتِ ارضی عنایت کیے جانے کے ناطے فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرح کے امور میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔ یہ گویا علامت (symbol) ہے کہ تمام فرشتے آدم کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ درحقیقت ضروری نہیں کہ اپنی پیشانی زمین پر ٹکائیں تو اسی کو سجدہ کہا جائے۔ کسی کے آگے جھک جانا بھی گویا سجدہ ہے۔ سجدۂ تعظیمی اس سے پہلے جائز رہا ہے مگر شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اسے مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا۔ سابقہ شریعتوں میں جھک کر کسی کی تعظیم کرنے کی ممانعت نہیں تھی‘ بلکہ تعظیماً جھکا جا سکتا تھا۔ اسی کو آج بھی بعض لوگ دلیل بناتے ہیں کہ سجدۂ تعظیمی اگر اولیاء اللہ یا ان کی قبروں کو کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے‘ حالانکہ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں سجدہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو مطلقاً حرام ہے۔ سجدہ کی کوئی بھی صورت عبودیت اور تذلّل کی علامت ہے‘ یعنی کسی کا مطیع ہو جانا‘ کسی کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

حضرت آدم علیہ السلام کا مقام اور آدمؑ و ذُریتِ آدمؑ کی خلافت کی اساس فلسفہ و حکمتِ دین کا ایک اہم موضوع ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک جملہ نقل کیا ہے کہ ’’خلافت کی بنیاد طاعت و زہد اور عبادت گزاری نہیں بلکہ علم و فہم ہے۔‘‘ اس لیے کہ عبادت گزاری تو فرشتے بھی کر رہے تھے ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾۔ یہ تمام چیزیں فرشتوں میں بتمام و کمال موجود تھیں‘ لیکن جب حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کیے گئے ’’علم الاسماء‘‘ کا مظاہرہ (demonstration) کرایا گیا تو گویا یہ بات ظاہر کر دی گئی کہ خلافت کی بنیاد علم ہے‘ اور میرے نزدیک وہ انسانی علم ہے‘ علم وحی نہیں۔

علمِ وحی کا ذکر اس رکوع کے آخر میں (آیت ۳۸) آئے گا اور اس سے تعلق امامت کا ہے‘ جبکہ خلافتِ ارضی کا تعلق اس علم انسانی سے ہے۔ چنانچہ اس سے یہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے کہ جو اقوام اس علم میں آگے نکل گئیں دنیا میں ترقی انہی نے کی ہے‘ زمین میں غلبہ انہی کا ہوا ہے۔ اگرچہ اُن کے پاس ایمان نہیں ہے‘ وہ اگر اللہ کو مانتے بھی ہیں تو سو طرح کے شرک کر رہے ہیں‘ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنایا ہوا ہے‘ شریعت کو پسِ پشت ڈالا ہوا

ہے‘ شدید گمراہی میں ہیں‘ اخلاقی پستی کے اندر مبتلا ہیں‘ لیکن اُن کے پاس زمین کا اختیار ہے‘ قوت اور اقتدار انہیں سونپ دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ دراصل زمین کی خلافت کا تعلق ہدایت سے نہیں‘ بلکہ اُس ’’علم الاسماء‘‘ سے ہے جو حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت نے اپنے ذرائع اور مشاہدے سے تدریجاً حاصل کیا۔

آیت ۳۵ ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵﴾ ’’اور ہم نے کہا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنّت میں‘ اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو‘ مگر اس درخت کے قریب مت جانا‘ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔‘‘

آدمؑ و ذُرّیتِ آدمؑ کے لیے انتباہ

خلافتِ آدمؑ کے فیصلے کے بعد ایک demonstration تو فرشتوں کے سامنے کرائی گئی کہ حضرت آدمؑ کو جو ہم نے خلافت عطا کی ہے وہ اُس علم الاسماء کی بنیاد پر ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا۔ اب دوسری demonstration حضرت آدمؑ کے سامنے کرانا مقصود ہے کہ ابلیس تمہارا ازلی دشمن ہے جس نے تکبر کی بنیاد پر جھکنے سے انکار کیا‘ یہ تمہیں ورغلائے گا اور تباہ و برباد کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات پر وہ الفاظ موجود ہیں جن میں ابلیس نے چیلنج کرتے ہوئے حضرت آدمؑ اور اُن کی ذُریت سے اپنی دشمنی کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ جب اُسے کہا گیا کہ جاؤ تمہیں قیامت تک کے لیے مہلت دی گئی ہے کہ تم انہیں جس طریقے سے چاہو گمراہ کرنے کی کوشش کر لو‘ تو اُس نے دھڑلے سے یہ بات کہی: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۲﴾ ’’پروردگار! تیری عزت اور اقتدار کی قسم! مَیں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔‘‘ ﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۸۳﴾ (صٓ) ’’سوائے تیرے اُن بندوں کے جنہیں تو خود اپنا بنا لے۔‘‘ مُخْلَص یہاں اسم المفعول آیا ہے‘ یعنی جنہیں تُو اپنے لیے خالص کر لے‘ جن پر تیرا خصوصی فضل ہو‘ جن پر تیری خصوصی نگاہِ کرم ہو‘ تیری عنایت خصوصی جن کے شاملِ

حال ہو جائے‘ ان کا معاملہ مستثنیٰ ہوگا‘ باقی مَیں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔

سورۃ الحجر میں یہی الفاظ مزید اضافے کے ساتھ آئے ہیں: ﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰﴾ ’’پروردگار! چونکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے مَیں یقیناً مزین کر دوں گا ان کے لیے زمین میں (دنیا کو) اور مَیں ضرور گمراہ کر دوں گا ان سب کو‘ سوائے تیرے اُن بندوں کے جن کو تُو ان میں سے (اپنے لیے) خالص کر لے۔‘‘ یعنی مجھے تُو نے اتنی کڑی آزمائش میں ڈالا‘ میرا پندار اور میرا کردار مجروح ہوا جس کے نتیجے میں مَیں یہ غلط حرکت کر بیٹھا کہ تیرے حکم کو ماننے سے انکار کیا‘ تو گویا تُو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ تو اَب مَیں ان کے لیے زمین کے اندر مختلف چیزوں اور مختلف مشاغل کو بڑا مزین کر دوں گا‘ اور اسی میں یہ مشغول ہو جائیں گے‘ اسی کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ مال و اسبابِ دنیوی ہی ان کا مطلوب و مقصود بن جائے گا‘ اس کے لیے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں گے‘ خون بہائیں گے۔ وہی ان کا مطلوب و مقصود ہوگا۔ مَیں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا‘ سوائے اُن بندوں کے جن کو تُو اپنے لیے خالص کر لے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اُس کے متکبرانہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ جب فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا گیا تو اُس نے یہ کہنے کے بعد کہ ’’کیا میں اِس کو سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟‘‘ مزید کہا تھا: ﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۲﴾ ’’ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تُو نے مجھ پر فضیلت دی ہے‘ اگر تُو مجھے مہلت دے دے قیامت کے دن تک‘ تو مَیں اس کی پوری نسل کو قابو میں کر کے چھوڑوں گا‘ سوائے بہت تھوڑے سے لوگوں کے۔‘‘ پروردگار! یہ آدم جس کا تُو نے یہ اکرام کیا ہے‘ مجھ سے افضل قرار دیا ہے‘ تُو مجھے اسے سجدہ کرنے کا حکم دے رہا ہے؟ اگر تُو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو مَیں اس کی ساری ذُریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا‘ سب کو نکیل ڈال دوں گا اور اِن سب کو غلط راستے پر لے جاؤں گا۔

ابلیس کے چیلنج کے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ الفاظ سورۃ الاعراف میں آئے ہیں: ﴿قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ﴿۱۷﴾﴾ ’’اُس نے کہا: (پروردگار!) تُو نے جو مجھے (آدم کی وجہ سے) گمراہ کیا ہے تو اَب میں لازماً ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا تیری سیدھی راہ پر۔ پھر مَیں ان پر حملہ کروں گا ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے‘ اور ان کے دائیں اور بائیں جانب سے‘ اور تُو نہیں پائے گا ان کی اکثریت کو شکر کرنے والا۔‘‘ پروردگار! تُو نے مجھے گمراہ کر دیا‘ مَیں راندۂ درگاہ ہو گیا‘ تو اب مَیں ان کو بھی چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ع ’’ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!‘‘ تُو نے جو مجھے مہلت دی ہے اب مَیں تیرے سیدھے راستے پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا۔ صراطِ مستقیم جو تیری توحید کا راستہ ہے‘ مَیں اُس پر مورچہ لگاؤں گا۔ ان کے لیے اپنی کمین گاہیں بناؤں گا۔ پھر مَیں ہر چہار طرف سے ان پر حملہ آور ہوں گا۔ ان میں سے اکثر کو تُو شکر کرنے والا نہیں پائے گا کہ جو مقام فضیلت تُو نے اسے اور اس کی ذُریت کو عطا کیا ہے اُس پر تیرا شکر ادا کر سکیں اور اس کا حق ادا کر سکیں۔ اُس کے چیلنج کا تو یہ انداز تھا‘ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو متنبہ کرنے کے لیے کہ یہ تمہارا ازلی دشمن ہے‘ اس کو تم پہچان لو‘ ایک تجربہ کرایا جا رہا ہے۔

﴿وَقُلۡنَا يٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ﴾ ’’اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی اب جنت میں رہو۔‘‘

یہ کون سی جنت ہے‘ اس میں اختلاف ہے۔ ایک تو وہ جنت الخلد ہے جس میں داخل ہونے کے بعد پھر کسی کو نکالا نہیں جائے گا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ وہ جنت نہیں ہے‘ البتہ کوئی آزمائشی جنت ہے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں حضرت آدم اور اماں حوا علیہما السلام کو عارضی طور پر رکھا گیا۔ بائبل میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ یہ جنت زمین پر ہی کسی بلند مقام پر تھی‘ بلکہ بائبل کے ماہرین اپنے اندازے کے مطابق نشان دہی کرتے ہیں کہ کردستان کے پہاڑی علاقہ میں کوئی جگہ تھی جہاں ساری ضرورتیں اور آسائش و آرام مہیا تھا‘ وہاں حضرت آدمؑ و

اماں حوا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ تاہم یہ بھی واضح رہے کہ اصل بائبل تو تقریباً ساتویں قبل مسیح میں گم ہو گئی تھی‘ بعد میں جو بائبل مرتب کی گئی ہے اس میں اکثر و بیشتر باتیں غیر مستند ہیں۔ بہرحال یہ ایک رائے ہے۔ یہ امکانات اور احتمالات تو ہیں‘ لیکن تیقّن کے ساتھ کچھ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ یہاں سے بھی یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آزمائشی طور پر ایک demonstration کے لیے کہ حضرت آدمؑ کو معلوم ہو جائے کہ میرا دشمن ابلیس کس کس طور سے مجھے ورغلا سکتا ہے‘ کس کس طرح کے حیلے اور حربے اختیار کر سکتا ہے‘ کیسے کیسے وساوس میرے دل میں ڈال سکتا ہے‘ مجھے توحید اور اطاعتِ الٰہی کے راستے سے منحرف کر سکتا ہے‘ صرف اس کا ایک تجربہ کرانا مقصود تھا۔ اب خواہ یہ تصور ہو کہ تخلیقِ آدمؑ کے سارے مراحل آسمانوں میں طے پائے ہیں‘ پھر ہبوطِ ارضی ہوا ہے‘ چاہے یہ تصور ہو کہ زمین پر ہی یہ سارے مراحل طے پائے ہیں‘ اس لحاظ سے وہ جنتِ ارضی کسی جگہ پر کوئی اونچا مقام ہو جسے جنت سے تعبیر کیا گیا ہو۔

﴿وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا﴾ ’’اور تم دونوں اس میں سے جہاں سے چاہو‘ جو چاہو بفراغت کھاؤ۔‘‘

تمام پھل اور میوے تمہارے لیے موجود ہیں‘ جہاں سے چاہو تم استفادہ کرو۔

﴿وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ’’لیکن مت قریب پھٹکنا اِس درخت کے‘ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔‘‘

اگر تم نے اس درخت کا پھل کھایا تو تم ظلم کرنے والے‘ حد سے تجاوز کرنے والے‘ اللہ کے حکم سے انحراف کرنے والے ہو جاؤ گے۔

جس طریقے سے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھا گیا اس کی کیفیات قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں خاص طور پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى ﴿۱۱۸﴾﴾ ’’(اے آدم! ہم تمہیں جس جنت میں رکھ رہے ہیں یہاں تمہیں یہ کیفیات حاصل رہیں گی کہ) یقیناً اس میں نہ تو تمہیں بھوک لگے گی اور نہ عریانی لاحق

ہوگی۔'' ﴿وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اور یہ کہ اس میں نہ تمہیں پیاس ستائے گی نہ ہی دھوپ (کی حدّت) محسوس ہوگی۔'' یہ الفاظ ہیں جن میں اُس جنت کی کیفیت کی تعبیر کی گئی ہے جس میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو رکھا گیا۔

الشجرۃ سے مراد

باقی رہ گیا یہ سوال کہ وہ درخت کون سا تھا' اس کی قرآن مجید نے قطعاً کوئی وضاحت نہیں کی' بلکہ صاف نظر آرہا ہے کہ اس بحث سے قرآن کریم نے گویا کہ اعراض کیا ہے۔ ''هٰذِهِ الشَّجَرَةَ'' کہہ کر اشارہ کر کے بتا دیا کہ یہ درخت! کوئی زیادہ وضاحت نہیں کی۔ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں (speculations) کی گئی ہیں۔ چنانچہ بائبل کے مرتبین نے اسے علم کا درخت (tree of knowledge) قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کے اعتبار سے تو اس خیال کی نفی ہو جائے گی۔ ظاہر ہے علم ہی تو حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا جو اُن کے لیے وجہ امتیاز بنا۔ اب علم کو اُن کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دینا قرآن مجید کے ساتھ قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ البتہ کچھ اور خیالات بھی ظاہر کیے گئے ہیں۔ صاحبِ ''موضح القرآن'' شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے یہ تصور ظاہر کیا ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے پہلے تک جنت میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو کوئی حوائج انسانیہ لاحق نہیں تھیں۔ ظاہر ہے بول و براز کا سارا مسئلہ تو کھانے پینے سے متعلق ہے۔ گویا انہیں وہاں بھوک پیاس کی حاجت نہیں تھی۔ مذکورہ بالا آیت ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾﴾ سے ایک خاصا قوی استدلال بنتا ہے کہ بھوک نہیں لگے گی۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ ہر شے اتنی آسانی سے دستیاب ہوگی کہ بھوک کا تمہیں کوئی تجربہ نہیں ہوگا۔

اگر یہ مانا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین ہی پر ارتقا کے مراحل طے کر کے اُس جنت ارضی میں آئے تو ظاہر ہے کہ کھانا پینا' بول و براز تو گویا ابتدا سے ان کے ساتھ تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی عارضی دور اُن پر ایسا طاری کیا گیا ہو جس میں یہ تجربہ کرانا مقصود ہو کہ تمہارا یہ دشمن تمہیں اس طور پر گمراہ کرسکتا ہے۔ اس کو ایک طویل خواب کی شکل بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر یہ کوئی آسمانی جنت ہے جس میں انہیں رکھا گیا اور حضرت

آدمؑ کی تخلیق اُس طور سے ہوئی کہ خاک کا پتلا بنا کر اس میں پھونک ماری گئی تو یہ چیز بھی قرآن مجید کے بیان سے مطابقت رکھتی ہے۔ پھر جیسا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کہہ رہے ہیں اُس وقت ابتدائی کیفیت ایسی ہو کہ حوائج ضروریہ' کھانا پینا اور بول و براز' اسی طرح کوئی شہوت کا جذبہ' کوئی جنسی عمل ابھی اُن کے شعور میں نہیں تھا' لیکن اُس درخت کا پھل کھانے کا نتیجہ یہ نکلا۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ استعاراتی انداز میں شاید یہ پہلا sexual act تھا جس کو شجرۂ ممنوعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ شیطان نے انہیں جو ورغلایا تھا تو یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں اس درخت سے اس لیے دور رکھا گیا ہے کہ کہیں تم ہمیشہ رہنے والے نہ بن جاؤ! اور درحقیقت انسان کا سلسلۂ توالد و تناسل ہی اس کے خلود کا ایک سبب بنتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے نسل انسانی کو دوام حاصل ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ مختلف آراء و خیالات ہیں' لیکن یہ صرف ایک آزمائش اور ایک تجربہ تھا' تاکہ انہیں متنبہ کر دیا جائے کہ یہ تمہارا دشمن ہے' تمہیں اس سے خبردار رہنا ہے۔ یہ تجربہ کہاں ہوا' اس کی تفصیلات کیا ہیں' اور پھر یہ کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کس کیفیت میں تھے' اس کے لیے کوئی مرفوع روایات موجود نہیں ہیں۔ کوئی تفصیلی چیزیں قرآن مجید کے کسی دوسرے مقام سے بھی ہمیں معلوم نہیں ہوتیں۔ البتہ یہ کہ جنت میں ایک درخت معیّن کر دیا گیا تھا کہ سوائے اس درخت کے جہاں سے چاہو' جو چاہو' کھاؤ پیو۔ اگر اِس درخت کا پھل کھاؤ گے تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

آیت ۳۶ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾﴾ ''پھر پھسلا دیا اُن دونوں کو شیطان نے اُس درخت کے بارے میں' تو نکلوا دیا ان دونوں کو اُس کیفیت میں سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا: تم سب اُترو' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اور تمہارے لیے اب زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔''

اغوائے شیطانی اور اس کا نتیجہ

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ ’’پس شیطان نے ان دونوں (حضرت آدم وحوا علیہما السلام) کو پھسلا دیا۔ زَلَّ: پھسل جانا‘ اَزَلَّ: (باب افعال) پھسلا دیا۔ ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ ’’تو اُن دونوں کو نکلوا دیا اس میں سے جس میں سے وہ تھے۔‘‘ یہ الفاظ بھی بڑے مبہم رکھے گئے ہیں۔ اس سے مراد ابھی وہ جنت نہیں ہے بلکہ اس جنت کی جو کیفیت ہے اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہ انداز وہاں استعمال کرتا ہے جہاں تفاصیل فہم انسانی کی گرفت سے ماوراء ہوں‘ جیسا کہ معراج کے تذکرہ میں فرمایا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝۱۶﴾ (النجم) ’’جبکہ ڈھانپے ہوئے تھا بیری کو جو ڈھانپے ہوا تھا۔‘‘ اب وہ کیا تھا‘ وہ تمہارے فہم سے ماوراء ہے‘ لہٰذا اس کی کوئی تفصیل یہاں نہیں دی جا رہی۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝۱۷﴾ ’’انہوں نے اپنے ربّ کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا۔‘‘ اُس وقت نبی کریم ﷺ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا۔ یہ انداز یہاں پر بھی ہے: ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ پس نکلوا دیا اُن دونوں کو اُس کیفیت سے اور اُس حالت میں سے جس میں وہ تھے۔ اس کی تعبیر سورۂ طٰہٰ کے متذکرہ بالا مقام کے حوالے سے کی جائے تو وہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی رائے سے مربوط ہو جائے گی‘ یعنی انہیں بھوک لگنی شروع ہوئی جو کہ پہلے نہیں تھی‘ یا کوئی مشقت کا مسئلہ تھا جو پہلے نہیں تھا۔ اب دھوپ نے بھی ستایا ہوگا اور یہ کیفیت پہلے نہیں تھی۔ بول و براز کا معاملہ بھی شروع ہوا جو پہلے نہیں تھا۔

اسی طرح جنسی عمل (sexual intercourse) کا معاملہ بھی شروع ہوا جو پہلے نہیں ہوگا۔ قرآن مجید کے دو مقامات پر آتا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کا نتیجہ یہ نکلا: ﴿فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (الاعراف:۲۲، طٰہٰ:۱۲۱) ’’پس ظاہر ہو گئیں ان کے لیے اُن کی شرم گاہیں (جنسی اعضاء) اور وہ لگے گانٹھنے جنّت کے (درختوں کے) پتوں کو اپنے اوپر (لباس بنانے کے لیے)۔‘‘ اس کی کیا تعبیر ہوگی؟ اس درخت کی وہ کیا تاثیر تھی؟ بائبل کے مرتّبین کا خیال یہ

ہے کہ وہ پہلے سے برہنہ تھے مگر انہیں اس کا احساس نہیں تھا‘ کیونکہ ابھی انہوں نے ’’شجرۂ علم‘‘ سے نہیں کھایا تھا‘ ابھی انہیں شعور حاصل نہیں ہوا تھا۔ گویا ان کے اپنے فلسفہ ارتقاء کی رو سے ابھی آدم وحوا حیوانیت کی سطح سے نکلے ہی تھے‘ ابھی ان میں اپنے ستر اور شرم وحیا کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے وہ شجرۂ ممنوعہ کھایا تو اس سے انہیں اپنی ستر گاہوں کا احساس وشعور پیدا ہوا اور پتوں کو گانٹھ کر اپنے لیے لباس کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔ بائبل کے مرتّبین نے تو اسے fig tree کہا ہے جس کے پتوں سے انہوں نے لباس تیار کرنے کی کوشش کی۔ جس علاقے میں ان کا خیال ہے کہ وہ آزمائشی جنت تھی جہاں پر کہ حضرت آدم واماں حوا علیہما السلام کو رکھا گیا‘ وہاں انجیر کے درخت بہت زیادہ ہیں۔ ’’جبل تین‘‘ اسی علاقے میں ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا مسکن تھا اور جہاں پر سیلاب آیا۔ ان کے محققین کے نزدیک اسی علاقہ میں نسلِ آدمؑ کا آغاز ہوا ہے۔ یہ اُن کے اپنے نظریات ہیں۔ قرآن کریم میں بس اشارہ فرما دیا گیا: ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ ’’تو اُن دونوں کو نکلوا دیا اس میں سے جس میں سے وہ تھے۔‘‘ اصلاحی صاحب نے بڑا لطیف لفظ استعمال کیا ہے اور بڑی عافیت کے ساتھ یہاں سے گزر گئے ہیں کہ کوئی حُلّۂ جنت تھا وہ ان سے سلب کر لیا گیا‘ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی تھی۔ وہ ایک جنتی لباس تھا اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس لباس کی حقیقت کیا تھی‘ وہ لباس کس نوعیت کا تھا جو ان کو عطا ہوا تھا؟ وہ ان سے لے لیا گیا۔ ان پر ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور ان کو اپنی عریانی کا احساس ہوا۔

﴿اَزَلَّهُمَا﴾ کی تفہیم کے لیے قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے حوالے نوٹ کیجیے۔ شیطان نے جو حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو بہلایا‘ پھسلایا یا ورغلایا اس کے لیے سورۂ طٰہٰ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝۱۲۰﴾ ’’تو وسوسہ ڈالا اُس کے ذہن میں شیطان نے‘ اُس نے کہا: اے آدم! کیا میں بتاؤں تجھے ہمیشہ رہنے والے درخت اور ایسی بادشاہی کے بارے میں جو کبھی پرانی نہ ہو؟‘‘ یعنی یہ رُو در رُو مکالمہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کے لیے لفظ وسوسہ

استعمال کیا گیا ہے۔ شیطان نے وسوسہ اندازی کی کہ اے آدم! کیا مَیں تجھے وہ درخت بتاؤں کہ جو خلد اور ہمیشگی کا درخت ہے اور ایسی حکومت اور شہنشاہی عطا کرنے والا درخت ہے کہ جس پر بوسیدگی طاری نہیں ہوگی‘ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہے گی۔ سورۃ الاعراف میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور اُس نے کہا (وسوسہ اندازی کی) کہ نہیں روکا ہے آپ دونوں کو آپ کے رب نے اس درخت سے مگر اسی لیے کہ کہیں آپ فرشتے نہ بن جائیں یا کہیں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے نہ ہو جائیں۔‘‘ کہیں تمہیں خلد اور بقائے دوام حاصل نہ ہو جائے! تو یہ وسوسہ اندازی ہے جو شیطان نے حضرت آدم اور اماں حوا علیہما السلام کو کی۔ اس کے بارے میں کہا گیا: ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ﴾ (الاعراف:۲۲) ’’پس اُس نے انہیں دھوکا دے کر (اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی پر) آمادہ کر ہی لیا۔‘‘

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾

’’اور ہم نے کہا (فیصلہ سنا دیا) کہ اتر جاؤ‘ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں۔‘‘

﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾﴾

’’اور اب زمین میں تمہارے لیے جائے قرار ہے اور برتنے کا ساز و سامان ہے ایک خاص وقت تک کے لیے۔‘‘ اس زمین میں زندگی کے لیے ناگزیر ضروریات ہم نے فراہم کر دی ہیں ایک خاص مدّت تک کے لیے۔

ھَبَطَ کے معنی ہیں کسی بلندی سے نیچے اترنا‘ تو یہاں جو لفظ ’’اِھْبِطُوْا‘‘ آیا ہے اس سے یقیناً اُس نظریے کو بہت تقویت حاصل ہوتی ہے کہ تخلیقِ آدم کا سارا مرحلہ جو اب تک بیان ہوا ہے‘ یہ کسی بلند مقام پر‘ کہیں آسمانوں میں ہی ہوا ہے‘ اور اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا۔ حکم دیا جا رہا ہے کہ اُتر و اب زمین پر۔ البتہ ’’ھبوط‘‘ کا ایک دوسرا معنی آباد ہونا (settle down) بھی ہے جس سے دوسرے تصور کا اثبات ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرا تصور بھی قرآن سے reconcile کرتا ہے۔ یہ بات مَیں یہاں صرف

احتمال کے درجے میں رکھ رہا ہوں۔ بہرحال ھبوط کا لفظ کسی بلند مقام سے اترنے کے لیے بھی آتا ہے اور اس معنی میں بھی کہ کہیں آباد ہو جانا۔ جیسا کہ زندگی کا ایک تو nomadic انداز ہوتا ہے‘ خانہ بدوش ہیں‘ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ کسی چراگاہ کے پاس خیمے لگا دیے ہیں‘ مگر جب وہاں جانوروں کے چرنے کے لیے کچھ نہیں رہا تو اب خیمے اکھاڑے اور کہیں اور چلے گئے۔ ایک ہے کسی جگہ پر مستقل قیام کر لینا یا settle ہو جانا۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں بنی اسرائیل کے ضمن میں آیا ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ ’’تو اُتر پڑو کسی شہر میں تو تم کو مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۔‘‘ بنی اسرائیل جب صحرائے سینا میں مسلسل سفر میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس صحرا نوردی کے دوران منّ وسلویٰ کی صورت میں اُن کے لیے غذا کا بھی بندوبست کیا تھا۔ پھر انہوں نے ناشکری کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم اس ایک غذا پر صبر نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اُن چیزوں کا مطالبہ کیا جن کے اُن کو مصر میں اپنی غلامی کے دور میں چسکے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو زمین سے اُگنے والی چٹخارے دار چیزیں چاہئیں۔ ترکاریاں اور ککڑیاں ہوں‘ پیاز اور لہسن ہو‘ دالیں ہوں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا...﴾ تو تم کسی شہر میں آباد ہو جاؤ۔ یہ چیزیں تو کسی جگہ مستقل قیام کر کے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تو وہاں بھی لفظ ’’ھبوط‘‘ آیا ہے۔

اولادِ آدم اور شیطان کی باہمی دشمنی

﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ’’تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔‘‘ ابلیس اور جو بھی اُس کی ذُریت اور جنات میں سے اُس کے پیروکار ہیں‘ اُن کا مادّۂ تخلیق آگ ہے۔ لہٰذا ان میں جوش و خروش اور حرارت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی فطرت میں نشوز کا مادّہ زیادہ غالب ہے۔ اُس معیّن ابلیس یعنی عزازیل نے ذُرّیتِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی تھی‘ جو اُسے دے دی گئی۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ تجھے مہلت دی جا رہی ہے‘ تمہاری یہ درخواست قبول کی گئی۔ تم اپنی پوری محنت کر سکتے ہو‘ ذُریتِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کی پوری کوشش کر لو‘ تمہیں کھلی چھوٹ دی جا رہی

ہے۔ البتہ ایک بات سورۂ بنی اسرائیل میں اور دوسرے مقامات پر واضح کر دی گئی: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’یقیناً میرے بندوں پر تجھے کچھ اختیار نہیں ہوگا‘ سوائے اُن کے جو خود تیری پیروی کریں گمراہوں میں سے۔‘‘ ٹھیک ہے تم ان کے لیے جو چاہو مزیّن کرو‘ برائی کو خوشنما انداز سے پیش کرو‘ وسوسہ اندازی کرو‘ جس طرح چاہو انہیں ورغلاؤ‘ لیکن تمہیں ان پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا‘ سوائے اُن کے جو خود تیری پیروی کریں۔ خود اُن کے اندر بھی سرکشی ہو‘ شر کا میلان ہو۔ وہ خود معصیت‘ تکبر اور دُنیا پرستی میں مبتلا ہوں اور تیری آواز پر لبیک کہیں۔ ان کو تُو جدھر چاہے لے جا‘ لیکن میرے وہ بندے جو اپنے آپ کو مجھ سے وابستہ کر لیں‘ مجھ پر ایمان رکھتے ہوں‘ مجھ پر توکّل کرتے ہوں‘ اُن پر تیرا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ابلیس‘ اُس کی ذُریت اور جِنّات میں سے اُس کے پیروکار سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام اور ذُرّیتِ آدم کی دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔

دراصل یہ عداوت خیر و شر کی ایک کشمکش ہے جو تاریخ انسانی کا ایک مستقل نظریہ ہے۔ خیر کی قوتیں انسان کے اندر بھی ہیں اور خارج میں بھی ہیں۔ انسان کے اندر جو روحِ ملکوتی پھونکی گئی وہ خیر کی طرف بلانے والی ہے۔ خارج میں انبیاء کرام علیہم السلام‘ صلحاء اور اُن کے متبعین ہیں۔ پھر ملائکہ ہیں جو نیکی کے راستے پر انسان کی تقویت کا ذریعہ بنتے ہیں اور شاباش دیتے ہیں۔ خارج میں یہ تمام قوتیں خیر کی طرف بلانے والی ہیں۔ شر کی طرف بلانے والا انسان کا اپنا id and libido ہے‘ اس کا نفسِ امّارہ اور اس کے حیوانی تقاضے (animal instincts) ہیں۔ شر کی طرف بلانے والے یہ عناصر اس کے اپنے اندر ہیں۔ یہ خیر و شر کی کشاکش ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

تاریخ انسانی درحقیقت انہی قوتوں کی باہمی کشاکش کی داستان ہے۔

﴿وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۳۶﴾﴾ ’’اور اب زمین میں

تمہارے لیے جائے قرار ہے اور برتنے کا ساز و سامان ہے ایک خاص وقت تک کے لیے۔‘‘ اس زمین میں زندگی کے لیے ناگزیر ضروریات ہم نے ودیعت کر دی ہیں ایک خاص مدّت تک کے لیے۔ یہیں تمہیں ٹھہرنا ہے‘ یہیں آباد ہونا ہے‘ اور اس میں ہم نے زندگی کی ساری ضروریات ایک مدّتِ معینہ کے لیے فراہم کر دی ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾﴾ ’’پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات‘ تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا‘ بہت رحم فرمانے والا۔‘‘

آدم و حوا علیہما السلام کی توبہ

یہ مسئلہ بھی سورۃ الاعراف میں تفصیل سے آچکا ہے‘ بایں معنی کہ سورۃ الاعراف ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھی جبکہ سورۃ البقرۃ مدنی سورت ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ مضمون وہاں تفصیل سے آچکا ہے۔ اس مقام سے پہلے قرآن مجید کے چھ مقامات پر یہ قصۂ آدم و ابلیس بیان ہو چکا ہے۔ کہیں اس کا کوئی ایک مضمون زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے تو کہیں کوئی دوسرا مضمون۔ کہیں ابلیس کا چیلنج زیادہ مفصل آیا ہے تو کہیں ابلیس نے جو تکبر کیا اس کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہیں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا تذکرہ بھی ہے اور جِنّات کی تخلیق کا تذکرہ بھی۔ یہ چھ مقامات مکی سورتوں (سورۃ الاعراف‘ سورۃ الحجر‘ سورۂ بنی اسرائیل‘ سورۃ الکہف‘ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ صٓ) کے ہیں جہاں پر یہ مضامین آئے ہیں۔ ان کے تقابلی مطالعہ سے یہ سب باتیں منکشف ہوتی ہیں۔ یہاں ان کا خلاصہ دیا جا رہا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک ندامت کا احساس پیدا ہوا کہ ان سے خطا ہوئی ہے‘ غلطی ہوئی ہے۔ توبہ کی اصل حقیقت انسان کے اندر گناہ پر ندامت کا پیدا ہو جانا ہے‘ اور یہی احساسِ ندامت ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت عزیز ہے۔ ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

حضرات آدم وحوا علیہما السلام کو جب اپنی غلطی پر ندامت ہوئی تو وہ گریہ وزاری میں مشغول ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں توبہ واستغفار کے چند کلمات خود تلقین فرما دیے۔ یہاں ارشاد فرمایا: ''پس آدم نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کر لیے'' اور ان کلمات کے ذریعہ سے جب انہوں نے توبہ کی' رجوع کیا' استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ توبہ واستغفار کے وہ کلمات سورۃ الاعراف میں بیان ہوئے ہیں:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۲۳﴾

''(اس پر) وہ دونوں پکار اُٹھے کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر' اور اگر تُو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم تباہ ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

یہ قرآن مجید کا بہت اہم موضوع ہے جس سے تورات بالکل خالی ہے۔ اسی وجہ سے عیسائیوں کے ہاں پیدائشی گناہ گار ہونے کا تصور موجود ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو گناہ سرزد ہوا تھا اُس کے اثرات نسلِ آدمؑ میں چلے آ رہے ہیں' جب کہ قرآن مجید میں یہ واضح کر دیا گیا: ﴿فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی۔'' اللہ تعالیٰ اپنی تمام عنایات کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی تمام عنایات' رحمتیں اور شفقتیں حضرت آدمؑ کے شامل حال ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا' اعتراف کیا' توبہ کی' رجوع کیا' استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ کو قبول فرما لیا۔

آیت ۳۸ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اُتر جاؤ! تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہاں وہی لفظ ''اهْبِطُوْا'' دُہرایا گیا ہے۔ یعنی جنت سے' خواہ وہ آزمائشی جنت تھی یا جنت خلد یا آسمانی جنت' حضرت آدم علیہ السلام کا نکالا جانا گناہ کی وجہ سے نہیں تھا۔ گناہ کی وجہ سے تو اُس کیفیت سے محرومی ہوئی جو اُس جنت میں انہیں حاصل تھی' یا جو جنتی لباس انہیں دیا گیا تھا اُس سے محرومی ہوئی عریانی کی صورت میں۔ باقی جنت سے اُن کا نکلنا اور زمین پر آنا تو درحقیقت اس لیے تھا کہ وہ زمین کی خلافت کے لیے ہی پیدا کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے انہیں یہاں آ کر اپنے منصب کا چارج تو سنبھالنا تھا۔ اسی لیے توبہ کی قبولیت کے بعد دہرا کر فرمایا جا رہا ہے: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ!'' چاہے وہ زمین ہی میں کسی اونچے مقام پر جنت تھی' یا آسمانی جنت تھی جہاں سے اُتارا گیا' یہ دونوں احتمالات موجود ہیں' لیکن یہ کہ سب کے سب اترو۔ اس کے بعد ابلیس بھی اسی زمین پر گھومتا پھرتا ہے' لوگوں کو ورغلاتا ہے' اُس کی ذریت بھی یہیں ہے اور حضرت آدمؑ کی نسل بھی یہیں ہے۔

حیاتِ ارضی کا ابدی منشور

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۳۸﴾ ''تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہ ہے علمِ انسانی کا دوسرا گوشہ' یعنی علم بالوحی (Revealed Knowledge)۔ اس چوتھے رکوع کا حسن ملاحظہ کیجیے کہ اس کے شروع میں علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کا ذکر ہے جو بالقوۃ (potentially) حضرت آدمؑ میں رکھ دیا گیا اور جسے انسان نے پھر اپنی محنت' اپنے حواس اور عقل کے ذریعے سے آگے بڑھایا۔ یہ علم مسلسل ترقی پذیر ہے اور آج مغربی اقوام اس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ کبھی ایک زمانے میں مسلمان بہت آگے نکل گئے تھے' لیکن ظاہر ہے کہ اس دنیا میں عروج تو انہی کو ہوگا جنہیں سب سے زیادہ اس کی آگہی حاصل ہوگی۔ البتہ وہ علم جو

آسمان سے نازل ہوتا ہے وہ عطائی (given) ہے‘ جو وحی پر مبنی ہے۔ انسان کے مقامِ خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکام اس کے پاس آئیں‘ وہ جو ہدایات بھی بھیجے ان کی پورے پورے طور پر پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ یہ گویا ابدی منشور (charter) اور فرمانِ خداوندی ہے حضرت آدمؑ اور اُن کی ذریت کے لیے‘ جیسے کسی وائسرائے کو چارج دیا جائے‘ پھر اسے کوئی چارٹر دیا جا رہا ہو۔

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ’’اور جو کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے‘ اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

جو ہماری آیات کا کفر کریں گے‘ ناشکری کریں گے‘ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے وہ آگ والے یعنی جہنمی ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

علم کے یہ دو گوشے ہیں۔ اس رکوع کے آغاز میں اُس علم انسانی یعنی مادی علوم کا تذکرہ ہوا جن کے حصول کا ذریعہ ہمارے اندر رکھ دیا گیا ہے‘ اور وہ ہیں ہمارے حواس اور ان کے اوپر عقل جو مزید استنباط اور استدلال کرتی ہے۔ خلافت کا اصل تعلق اسی علم سے ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اسی کی بنیاد پر خلیفہ بنائے گئے۔ فرشتوں کے اشتباہ کے جواب میں اسی علم کی demonstration کرائی گئی۔ دوسرا علم ہدایت ہے جو انسان کو تدریجاً عطا ہوتا رہا۔ جیسے جیسے انسانی شعور کا ارتقاء ہوا‘ جیسے جیسے انسان کا تمدنی ارتقاء ہوا‘ جیسے جیسے انسان کے ذرائع رسل و رسائل بڑھتے چلے گئے اسی طرح اُس نے ہدایت کے مراحل طے کیے۔ یہاں تک کہ آج سے چودہ سو برس قبل وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ’’الھُدٰی‘‘ (The Final Guidance) کی شکل میں بصورتِ قرآن آخری کتاب کے طور پر نازل ہوا۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمین

یہ علم ہدایت ہے کہ زمین پر رہتے ہوئے انسان نے کس طرح زندگی گزارنی ہے۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ کدھر جانا ہے اور کدھر نہیں جانا۔ خاص طور پر اجتماعیات کے اعتبار سے بڑی راہ نمائی ہے‘ جہاں بڑی پیچیدگیاں ہیں‘ بڑے عقدہ ہائے لاینحل ہیں‘ جن کو حل کرنے کے لیے انسان کے پاس ذرائع موجود نہیں ہیں اور وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ’’الہدیٰ‘‘ کو امام بنا لے تو پھر خلافتِ ارضی کے تحت تسخیرِ کائنات میں بڑھتا چلا جائے گا۔ ایسے میں کوئی خرابی‘ کوئی شر وجود میں نہیں آئے گا۔ اصل میں اِس دور کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ انسان نے الہدیٰ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور صرف علم انسانی و علم مادی میں ترقی کرتا ہوا ایک انتہا کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ عدم توازن ہے جس نے اس دور کو دورِ دجالی بنا دیا ہے۔ ۞۞۞

اسلام اور اُمتِ مسلمہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا کرۂ ارضی ایک بار پھر نغمۂ توحید سے معمور ہو سکے گا؟
کیا موجودہ حالات اور مستقبل کے حوالے سے ہم پر کوئی ذِمہ داری بھی عائد ہوتی ہے؟
ان سوالات کے مفصل جواب پر مشتمل محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر انگیز مضامین کا مجموعہ

سابقہ اور موجودہ
مُسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل
اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذِمہ داری

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور
قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

حقیقتِ نفاق (۲)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نفاق کی تیسری سٹیج

نفاق کا سارا معاملہ انقلاب اور جہاد ہی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ صرف نماز‘ روزہ کی ادائیگی میں جان و مال جانے کا اندیشہ نہیں اس لیے اس حد تک نفاق کھل کر سامنے نہیں آتا۔ یہ تو وہاں پر ہی ظاہر ہوتا ہے جہاں جان اور مال کے لگانے کا تقاضا ہو رہا ہو۔ مسجد نبوی میں نمازیں تو عبداللہ اُبی بھی رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پڑھتا تھا لیکن غزوۂ اُحد میں وہ ۳۰۰ منافقین لے کر الگ ہو گیا‘ کیونکہ وہاں پر اس کو اپنی جان کا خطرہ نظر آ رہا تھا۔ بہرحال جب یہ بات بڑھے گی تو ایسے آدمی میں غیر شعوری طور پر صادق الایمان لوگوں سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ ذلیل کرواتے ہیں۔ اگر سب ہی ایک جیسے ہو جائیں تو کوئی نہ آگے رہا نہ پیچھے‘ مگر ان (ایمان والوں) کو جب بھی پکارا جاتا ہے تو فوراً چل پڑتے ہیں۔ نہ ان کو جان کا کوئی خیال نہ مال کا‘ نہ اہل وعیال کا کوئی خیال نہ گھر بار کا‘ یہ تو دیوانے (fanatics) ہو گئے ہیں۔ دین نے ان کی مت ماردی ہے۔ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں‘ نہ دائیں دیکھتے ہیں نہ بائیں‘ نہ خطرے کو دیکھیں نہ رزق کی فکر کریں۔ نہ دیکھتے ہیں کہ جان جاتی ہے نہ مال کی فکر‘ کسی خطرہ کو نہیں سمجھتے۔ یہ منافقین کے خیالات تھے۔ پس اہلِ ایمان کو تو جب بھی رسول اللہ ﷺ کی پکار آئی تو انہوں نے فوراً لبیک کہا۔ ایسے میں کچھ لوگ آگے بڑھ گئے اور کچھ پیچھے رہ گئے تو بڑھنے والوں کی وجہ سے پیچھے رہنے والے نمایاں ہو گئے۔ منافقین کی سوچ یہ ہو گئی کہ اگر یہ لوگ بھی بیٹھے رہتے تو ہم ذلیل نہ ہوتے‘ ان کی بے وقوفی نے ہمیں رسوا کیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ

السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳﴾

’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں‘ وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بے وقوف (احمق) لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ ہو جاؤ کہ وہی بے وقوف ہیں‘ لیکن انہیں علم نہیں ہے۔‘‘

سیرتِ طیبہ سے اس بات کی گواہی ملتی ہے کہ انقلاب کی راہ میں مصائب ضرور آتے ہیں‘ چاہے شعب ابی طالب ہو یا طائف کی گلیاں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی پکار پر ہمیشہ لبیک کہہ کر مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے مال اور جان کی قربانی دی۔ غزوۂ موتہ میں تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ رومن فوج سے ٹکرا رہا ہے۔ مادی سمجھ بوجھ والے لوگ اس کو ہرگز بھی عقل مندی نہیں کہیں گے لیکن مؤمن کی نگاہ دنیاوی فتح پر نہیں ہوتی۔ اس کو تو شہادت کی صورت میں اللہ کی رضا مطلوب ہوتی ہے‘ اسی لیے وہ پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اس غزوہ میں حضرت جعفر طیّار‘ حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور بڑی حکمت کے ساتھ لشکر کو دشمن کے نرغہ میں سے نکال کر لے آئے۔

پس جو لوگ خطرات کی پروا کیے بغیر اللہ کے راستہ میں اپنے مال و جان سے آگے بڑھتے ہیں‘ ان کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والے یقیناً نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر ایمان کی مثبت کیفیت ہو تو ایسے لوگ آگے بڑھ جانے والوں کے لیے دعائیں کریں کہ اگر ہم کمزور تھے‘ ہم سے تو نہ ہو سکا تو چلو اللہ نے ان لوگوں کو ہمت و توفیق دے دی۔ لیکن یہاں اعترافِ جرم والا معاملہ تو ہے ہی نہیں۔ جھوٹے بہانے کرنے‘ جھوٹی قسمیں کھانے کے بعد اب تو اہلِ ایمان سے دشمنی پیدا ہو گئی ہے کہ ان بے وقوف اور دیوانے لوگوں کی وجہ سے ہماری زندگی مشکل بن گئی ہے۔ جب غزوۂ تبوک کے لیے اہلِ ایمان نکل رہے تھے تو یہ منافقین ڈراتے تھے کہ کیا کر رہے ہو! عقل کے ناخن لو‘ اس گرمی کے موسم میں نکل رہے ہو‘ اتنا لمبا سفر تم نے کرنا ہے۔ کچھ اپنے نفع نقصان کا خیال‘ کوئی اپنے برے بھلے کی سمجھ ہے کہ نہیں! سورۃ التوبہ کی آیت ۸۱ میں ان کے لیے جواب دلوایا گیا: ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ ’’(اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے: جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔‘‘

اہلِ ایمان کو تو یہ اندیشہ ہے کہ اگر ہم فرض کی پکار پر لبیک نہیں کہیں گے‘ اللہ کے حکم کو پیٹھ دکھا دیں گے تو کہیں جہنم کی سزا مقدر نہ ہو جائے۔ اُس کی گرمی تو یہاں کی گرمی سے بہت شدید ہے۔ پھر وہ منافقین ڈراتے تھے کہ اتنے بڑے دشمن کے ساتھ لڑنے جا رہے ہو‘ عقل سے کام لو۔ غزوۂ بدر میں ایک اور تین کی نسبت تھی جبکہ اب سلطنت روم سے ٹکراؤ کی صورت میں ایک اور تینتیس کی نسبت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۵۲ میں رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ جواب کہلوایا گیا:

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ﴾

’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے: تم ہمارے بارے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو سوائے دو خوبیوں میں سے ایک خوبی کا!‘‘

یعنی دو کامیابیوں میں سے ایک کامیابی کا‘ چاہے شہادت ہو یا فتح! گویا تم ہمیں کس چیز سے ڈرا رہے ہو؟ ہمارے لیے تو دو بہترین انجام ہو سکتے ہیں‘ تیسرا کوئی ہے ہی نہیں۔ ہمارے لیے دونوں انجام یکساں احسن ہیں۔ اگر ہم اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں تو ہمارے لیے اس سے بڑا کوئی ثمر نہیں‘ اور اگر ہم تمہارے معیار کے مطابق کامیاب ہو کر آ جائیں تو بھی بامراد ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تو شہید اور غازی دونوں صورتوں میں کامیابی ہی تھی‘ تو ڈرنا کس بات کا! جو اللہ نے ان کے نصیب میں لکھی ہو‘ وہ اُسی پر خوش تھے۔

جب اہلِ ایمان سے دل میں دشمنی‘ بُغض اور عداوت اس حد تک ہو جائے کہ ان کے اللہ کے راستہ میں نکلنے پر ہی اعتراض ہو تو یہ نفاق کی وہ تیسری سٹیج ہے جس کے بعد واپسی ممکن نہیں ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۳ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب ایمان لائے ہو تو اس کے تقاضے پورے کرو۔ اللہ کی راہ میں مال و جان سے جہاد کرو جیسے دوسرے لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ایمان لانے کے بعد جہاد کر رہے ہیں۔ اس پر یہ لوگ جواب دیتے کہ کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں! گویا کہ منافقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو السُّفَهَاء کہنے کی جرأت کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ کے چوٹی کے تاجروں میں سے تھے۔ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم کا سرمایہ تھا لیکن انہوں

نے وہ پیسہ اُن غلاموں کو آزاد کرنے میں خرچ کیا جو ایمان لے آتے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سمیت چھ غلام اور کنیزیں ایسے ہیں جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ جو پُونجی باقی رہ گئی‘ وہ سب کی سب ہجرت کے وقت ساتھ لے کر گئے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ سفر ہے‘ راستہ میں نہ جانے کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ اپنے گھر والوں کے لیے کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے حالانکہ نابینا والد‘ جوان بیٹیاں موجود تھے۔ منافقین کے نزدیک یہ سب حماقت اور بے وقوفی تھی لیکن ان کی یہ کیفیت آج شاید ہمارے نزدیک بھی عقل مندی نہ ہو۔

اسی طرح غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں میرے پاس اتفاقاً بہت پیسہ تھا۔ میں نے سوچا اس مرحلہ پر تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بازی لے جاؤں گا‘ یعنی مسابقت کا جذبہ اُن لوگوں میں بھی تھا مگر یہ مقابلہ نیکی‘ خیر اور انفاق فی سبیل اللہ کے میدان میں تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کُل دولت کے دو حصے کیے۔ نصف گھر والوں کے لیے رکھا اور نصف رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ’’عمر! گھر والوں کے لیے کچھ چھوڑا؟‘‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’جی ہاں‘ نصف رکھا ہے اور نصف اللہ کی راہ میں حاضر ہے۔‘‘ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا مال لے کر حاضر ہوئے تو یہی سوال رسول اکرم ﷺ نے اُن سے کیا۔ انہوں نے کہا: ’’نہیں‘ گھر میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے نام کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔‘‘

منافقین سمجھتے تھے کہ وہ بہت عقل مند ہیں مگر حقیقت میں وہ بے وقوف تھے۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ حقیقتاً اصل نفع اور اصل خسارہ کیا ہے! جو سورۃ العصر کی روشنی میں خسارہ کی حقیقت سمجھ لے‘ اس کے نزدیک عقل مندی تو یہی ہے کہ اپنا جان و مال اللہ کی راہ میں لگا دیا جائے‘ اور جس کے دل و دماغ میں یہ بات نہ آ سکے‘ اس کے لیے دانائی یہی ہے کہ جان و مال بچا بچا کر‘ سنبھال سنبھال کر رکھے۔ دونوں صورتوں میں خرد کا تقاضا مختلف ہوگا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا: وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ..... وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔

غیر شعوری نفاق کی یہ کیفیت بڑھتی چلی جاتی ہے اور انسان کو خود اندازہ ہی نہیں

ہو پاتا۔ پہلے جھوٹے بہانوں سے آغاز ہوا‘ پھر جھوٹی قسمیں کھانے لگے اور اس کے بعد صادق الایمان لوگوں سے دشمنی‘ بُغض اور عداوت ہوگئی‘ کیونکہ وہ اللہ کے دین کے لیے اپنا مال و جان بڑھ بڑھ کر نثار کر رہے تھے۔ اس تیسری سٹیج پر پہنچ کر بھی یہ لوگ اپنے آپ کو منافق نہیں بلکہ عقل مند سمجھتے ہیں اور ایمان والوں کو بے وقوف کہتے ہیں۔ اسی لیے بتایا جا رہا ہے کہ منافقین جانتے ہی نہیں‘ شعور ہی نہیں رکھتے کہ نفاق میں کس قدر بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اب اس سطح پر پہنچ کر تو واپسی کا امکان نہیں۔ ان کے خیال میں دین پر عمل کرنا اچھی بات ہے لیکن دنیا کے تقاضے بھی دیکھنے چاہئیں‘ اپنی حفاظت کا بھی خیال ہونا چاہیے ـــــ اور یہی خیالات آج ہم اپنے اردگرد بھی سنتے ہیں۔ یہ دنیا کی سمجھ کہلاتی ہے جس کو ہم مسلمانوں نے اپنا معیار بنا لیا ہے۔ اسی وجہ سے آج ہمارا دین دنیا میں مغلوبیت کا شکار ہے‘ جس کی نقشہ کشی ’’مسدس حالی‘‘ میں اس طرح کھینچی گئی ہے:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اسلام دنیا میں اُس وقت غالب ہوا جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا تن من دھن سب کچھ دین کے لیے نچھاور کر دیا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو دین کے راستہ میں لگانے کے بجائے سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اس لیے آج دین کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے جبکہ ہماری دنیا خوب پھل پھول رہی ہے۔ اگر کسی کو ابھی دین کے تقاضوں سے واقفیت نہیں‘ دین کے احکامات کا علم محض نماز‘ روزہ تک ہی ہے تو ایسے شخص سے لاعلم رہنے کے حوالہ سے سوال تو ضرور کیا جائے گا‘ البتہ وہ نفاق کے حملہ سے بچا ہوا ہے۔ اس کے برعکس جس کے سامنے دین کے تقاضے واضح ہو جائیں‘ پھر بھی وہ شخص اپنے مال و جان کی محبت کی وجہ سے ان ذمہ داریوں سے پیچھے ہٹنے کا رویہ اختیار کرے‘ وہ یقیناً نفاق کے خطرہ میں ہے۔ سورۃ الحج کی یہ آیت اس کیفیت کو واضح کرنے کے لیے بہت اہم مقام ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ

وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪﴾

’’اور لوگوں میں سے ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے کنارے کنارے رہ کر۔ پھر اگر اسے کوئی خیر پہنچ جائے تو بڑا مطمئن ہوتا ہے‘ اور اگر اس پر کوئی آزمائش آ جائے تو وہ اپنے چہرے پر پلٹ جاتا ہے۔ خسارے میں رہے ایسے لوگ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور یہی ہے بالکل واضح خسارہ۔‘‘

یعنی دین کے راستہ پر چلنے میں اگر فائدہ ہو‘ خیریت رہے‘ مال و جان کا کوئی خطرہ نہ ہو تو مطمئن رہتا ہے جبکہ اگر کوئی کٹھن امتحان آ گیا تو گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ گویا وہ کردار سامنے نہیں ہوتا جو طارق بن زیاد کا تھا کہ اُندلس کے ساحل پر پہنچ کر کشتیوں میں آگ لگوا دی کہ کسی کے دل میں واپسی کا خیال ہی نہ آ سکے۔ اصل میں عقل تو سکھاتی ہے کہ سنبھل کر چلا جائے جبکہ جذبہ کہتا ہے کہ واپسی کا کوئی سوال نہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

سورہ العنکبوت میں منافقانہ کردار کی وضاحت یوں کی گئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑩﴾

’’اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے یہ ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر لیکن جب انہیں ستایا جاتا ہے اللہ کی راہ میں تو وہ لوگوں کی طرف سے پہنچائے ہوئے فتنہ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے جیسا کر دیتے ہیں۔ اور اگر (اے نبی ﷺ!) آپ کے رب کی طرف سے مدد آئے تو پھر وہ ضرور کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ تو کیا اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا نہیں ہے جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں ہے!‘‘

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ⑪﴾

’’اور اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا ان لوگوں کو جو حقیقی طور پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا منافقوں کو بھی۔‘‘

فرض کیجیے کہ حضرت بلال ؓ کی جگہ اگر کوئی کمزور ایمان والا ہوتا اور اسے کلمہ پڑھنے کے بعد تشدد کا سامنا کرنا پڑتا تو یقیناً گھبرا کر اس کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتا۔ یعنی آزمائش پڑنے کی صورت میں سرفروشی کے لیے تو تیار نہیں لیکن اگر مسلمانوں کو فتح اور مال غنیمت حاصل ہو جائے تو اس کو حاصل کرنے آ جاتے ہیں۔ جان لینا چاہیے کہ اللہ سب کی دلی کیفیت سے آگاہ ہے۔

غیر شعوری نفاق کے حوالہ سے اہم بات یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ اس کا ظہور ماضی ہی میں ہوتا تھا اور اب یہ ممکن نہیں۔ اس نفاق کا ذکر قرآن پاک میں بکثرت ملتا ہے جو سورۃ النساء، سورۃ التوبۃ، سورۃ الاحزاب میں اور مزید تفصیل سے سورۃ المنافقون میں آیا ہے۔ اگر اسلام کو غالب کرنے کی جدّ و جُہد ایک انقلابی تحریک کی شکل میں آگے بڑھے گی تو یہ کیفیات جیسے پہلے تھیں، ویسے ہی آج بھی نظر آ سکتی ہیں۔ انسانوں میں اللہ نے کچھ قوی ہمت لوگ بھی بنائے ہیں اور کچھ کمزور بھی۔ اگر کم ہمت لوگ اس تحریک میں شامل تو ہوں گے لیکن ساتھ چل نہیں سکیں گے تو جب تک اپنی غلطی کا اعتراف کرتے رہیں اور استغفار کرتے رہیں، منافق نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ضُعفِ ایمان کا شکار ہوں گے۔ البتہ اگر اپنی غلطیوں کو چھپانے کے لیے جھوٹ بولنا شروع کیا تو یہ نفاق کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر جھوٹی قسمیں کھانے لگے تو نفاق کی دوسری سٹیج میں داخل ہو گئے۔ اگر صادق الایمان لوگوں کے خلاف دل میں دشمنی پیدا ہو گئی تو یہ تیسری سٹیج آ گئی، جس کے بعد واپسی بہت مشکل ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴﴾ (المنافقون)

''(اے نبی ﷺ!) یہ دشمن ہیں، آپ ان سے ہوشیار رہیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے، یہ کہاں سے پھرائے جاتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع عطا فرمایا۔ اگر حضور ﷺ کے ساتھ مل کر دیگر صحابہ کرام ؓ کی طرح دین کی سربلندی کے لیے جدّ و جُہد میں اپنی جان قربان کر ڈالتے تو اُونچے درجات حاصل کر لیتے، لیکن

جان اور مال جیسی فانی چیزوں کی محبت میں اعلیٰ مقام کھو بیٹھے۔ آج بھی یہی صورتِ حال ہمارے سامنے ہے۔ دین اسلام مغلوبیت اور مظلومیت کی حالت میں ہے۔ حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ دین ہم سے ہماری صلاحیتوں، توانائیوں، قوتوں اور اوقات کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اگر ہم اس پکار پر لبیک نہیں کہتے تو یقیناً غیر شعوری نفاق کی زد میں آ سکتے ہیں۔

قومی سطح پر نفاقِ عملی

سورۃ التوبۃ کی مندرجہ ذیل آیات میں اس نفاق کا ذکر ہے جو سزا کے طور پر دنیا میں پیدا کر دیا جاتا ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۷۵﴾

''اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر تُو نے ہمیں اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور ہم ضرور ہو جائیں گے نیکوکاروں میں سے۔''

﴿فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۷۶﴾

''اور جب اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے عطا کیا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور منہ موڑ کر چل دیے۔''

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۷۷﴾

''پس اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اُس دن تک کے لیے جس روز وہ اُس سے ملاقات کریں گے، اس لیے کہ جو انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا اس سے روگردانی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرما دیا، غنی کر دیا تو اب وہ بخل کا شکار ہو گئے اور حال یہ ہو گیا کہ ﴿الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲﴾ (الھمزۃ) .....اب وہ اپنے مال و دولت کا حساب ہی لگاتے رہتے ہیں اور جو وعدہ اللہ سے کیا تھا وہ بھول گئے،

پیٹھ موڑ لی‘ اعراض کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کی سزا کے علاوہ دنیا میں نقد سزا یہ دی کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا‘ کیونکہ انہوں نے وعدہ خلافی کی اور وہ جھوٹ بولتے تھے۔

یہ نفاق کی وہ قسم ہے جو سزا کے طور پر ڈال دی جاتی ہے۔ آج یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری پاکستانی قوم پر مسلط ہوگئی ہے‘ کیونکہ ہم نے اللہ کے نام پر یہ ملک حاصل کیا تھا کہ ہم اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کریں گے۔ جیسا کہ قائد اعظم نے کہا تھا: ’’ہم پاکستان اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس میں اسلام کے اُصولِ حریت و مساوات کا عہدِ جدید میں ایک نمونہ پیش کر سکیں۔‘‘ یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا۔ برصغیر کی ہر گلی اور کوچہ میں پاکستان حاصل کرنے کی جدّوجُہد میں یہی نعرہ لگایا گیا تھا: ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ پاکستان بننے کے بعد ہم نے بحیثیت قوم اسلام قائم کرنے کے لیے کیا کیا؟ ہر کوئی اپنا کاروبار بڑھانے‘ اونچے گھر بنانے‘ اعلیٰ نوکریوں کی دوڑ میں لگ گیا۔ جو لوگ آگ اور خون کا دریا عبور کر کے‘ قربانیاں دے کر پاکستان پہنچے‘ ان کے گھروں میں بھی جب خوش حالی آئی تو پردہ ختم ہوگیا۔ اسی کی سزا ہے کہ آج ہمارے معاشرہ میں نفاق کی ساری علامات پائی جا رہی ہیں۔ جھوٹ‘ فریب‘ وعدہ خلافی‘ دھوکا دہی‘ خیانت‘ رشوت‘ کم تولنا ہر طرح کی بُرائی ہمارے قومی کردار کا جزو بن چکی ہے۔ یہ ہے وہ نفاقِ عملی جس کا شکار آج پوری پاکستانی قوم ہے‘ کیونکہ تاریخ انسانی میں شاید ہم نے ہی اجتماعی سطح پر اتنی بڑی وعدہ خلافی کا ارتکاب کیا۔ آج نہ کہیں اسلامی معاشرہ نظر آتا ہے نہ اسلامی قانون۔ نہ اسلامی حریت‘ نہ اسلامی مساوات‘ نہ اسلامی اخوت۔ ہمارے ملک میں تو صدر ایوب کے دور میں غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ کر دیے گئے تھے جن کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ اسلامی قوانین میں ترمیم کی گئی ہے اور ہم آج تک آرام سے بیٹھے ہیں۔ ہم دین سے بے رُخی کے سبب اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باوجود بحیثیت قوم ہمارے اعمال میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (آیت ۸)

’’اب بھی تمہارا رب چاہتا ہے کہ تم پر رحم کرے‘ اور اگر تم نے وہی کچھ کیا تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے۔‘‘

ہم اپنا طرزِ عمل تبدیل نہ کر کے اپنے آپ کو اسی وعید کا مستحق بنا رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنی کوتاہی کی تلافی کے طور پر پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کے قیام کے لیے شعوری کوشش نہ کی تو ہم وعدہ خلافی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا شکار ہوں گے۔ ایسا اسلامی نظام جس کی برکات سے عام آدمی بھی مستفید ہو سکے‘ جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اُس نے ہمیں یہ ملک عطا فرمایا اور معجزانہ طور پر اس کی حفاظت بھی فرما رہا ہے۔

بہرحال یہ وہ غیر شعوری نفاق ہے جس کی زد میں ہم میں سے ہر مسلمان انفرادی سطح پر بھی آ سکتا ہے جبکہ پاکستانی قوم تو اجتماعی سطح پر اس کا شکار ہے ہی‘ کیونکہ صرف ہم نے ہی اپنا ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا۔ اللہ کرے کہ اس ملک میں نفاذِ اسلام کی ہماری کوشش پوری دنیا میں نظامِ خلافت کے قیام کا پیش خیمہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مومنین صادقین میں شامل فرمائے اور دین کے تقاضوں کو شعوری طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین یاربّ العالمین!

نفاق سے بچاؤ اور حفاظت

پہلی چیز دوامِ ذکر: ذکر اللہ کا اہتمام کرنا یعنی دل میں اللہ کو حاضر رکھنا۔ دل کو غفلت کا شکار نہ ہونے دیا جائے‘ کیونکہ دل غافل ہوگا تو شیطان کا ڈیرہ بن جائے گا۔ البتہ دوامِ ذکر کے ضمن میں لوگوں کے ذہن میں مغالطے ہیں۔ جو سب سے بڑا ذکر ہے‘ لوگ اس کو بھولے ہوئے ہیں اور جو آخری درجہ کا ذکر ہے‘ اس کو ہی اصل سمجھ بیٹھے ہیں۔ سب سے بڑا اور مجسم ذکر تو قرآن حکیم ہے۔ سورۃ الحجر میں اس کو ’’الذکر‘‘ کہا گیا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾

’’ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

اسی طرح فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹﴾ (المنافقون)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کہیں تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔ اور جس کسی نے بھی ایسا کیا تو یہی لوگ خسارے میں جانے والے ہیں۔''

گویا قرآن کی تلاوت' اس میں تدبّر' اس کو یاد کرنا' اس پر غور و فکر کرنا بہت ضروری ہے۔

ذریعۂ ذکر میں نمبر دو پر نماز ہے۔ فرمایا گیا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰہٰ:۱۴) ''نماز کو قائم کرو' میری یاد کے لیے۔'' نماز قولی ذکر بھی ہے اور عملی بھی۔ نماز میں تلاوت کی جاتی ہے جو قولی ذکر ہے جبکہ رکوع و سجود میں اپنے وجود سے اللہ کی عظمت کو تسلیم کیا جاتا ہے تو یہ ذکر کی عملی شکل ہے۔

تیسری چیز مسنون دعائیں (ادعیہ ماثورہ) اور مسنون اذکار ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوں۔ زندگی کے ہر عمل کے لیے حضور ﷺ کی دعا موجود ہے۔ صبح اُٹھنے کی' بیت الخلا میں داخل ہونے کی' وضو شروع کرنے کی' فارغ ہونے کی' گھر سے نکلنے کی' مسجد میں داخل ہونے اور باہر آنے کی' سواری پر سوار ہونے کی' کپڑے پہننے کی' آئینہ دیکھنے کی دعا ہے۔ غرض یہ کہ زندگی کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں جس کے لیے دعا نہ بتائی گئی ہو' تاکہ انسان کوئی بھی عمل غفلت میں نہ کرے۔ اس میں کوئی اضافی وقت درکار نہیں' کوئی خاص ہیئت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس جو کر رہے ہیں' اس کی مناسبت سے اللہ کو یاد رکھا ہوا ہے۔ چونکہ یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں' اس لیے دو تعلق بن گئے: ایک تو اللہ تعالیٰ سے بذریعہ دعا' دوسرے حضور ﷺ سے بھی۔ اگر اپنے طور پر کوئی بہتر سے بہتر دعا بھی مانگیں گے تو پہلا تعلق تو ہو جائے گا لیکن دوسرا نہیں ہو سکے گا۔

چوتھے درجہ کے حوالہ سے یہ سمجھنا ہوگا کہ ایک روحانی طبیب کسی شخص کے بارے میں اندازہ لگا کر بتا سکتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کیا کمی ہے۔ مثلاً کسی میں توکّل کی کمی

ہے' کسی میں مال کی محبت زیادہ ہوتی ہے' کسی میں شہرت کی خواہش ہے' کسی میں نمایاں ہونے کا جذبہ بہت ہے' کسی میں تکبر کی بیماری ہے۔ مختلف لوگوں میں مختلف امراض ہوتے ہیں۔ کوئی ماہر اسی اعتبار سے ذکر بتاتا ہے کہ فلاں آیت کا مراقبہ کیا کرو۔ مراقبہ کے لفظ سے کوئی خاص تصور نہ لیا جائے بلکہ اس سے مراد دھیان اور توجہ کرنا ہے' یعنی مخصوص آیت کے معنی کو اپنے ذہن میں جمانا ہے تاکہ شخصیت میں جو کمی ہے' اس کی تلافی ہو سکے۔ یہ ذکر کا چوتھا درجہ ہے۔ اس حوالہ سے ہمارے صوفیائے کرام علم نفسیات کے بہت بڑے ماہر گزرے ہیں۔

پس نفاق سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ انسان کوئی بھی کام کر رہا ہو لیکن دل اللہ کے ساتھ لگا رہے' زبان اس کی یاد سے تر ہو۔ اس کی اولاد' اموال' کاروبار کچھ بھی اسے اللہ کی یاد سے غافل نہ کر سکے۔ اگر گاڑی پر کہیں جا رہے ہیں تو اس وقت جتنا قرآن کریم کا حصہ یاد ہو' اس کو پڑھتے جائیں۔ اس سے بڑا ذکر تو کوئی ہے ہی نہیں۔

نفاق کا علاج اور ازالہ

اگر دل میں نفاق کی کوئی آلائش محسوس ہو تو اس کا ازالہ کرنے کے لیے دو کام کرنے ہوں گے:

(۱) نفاق کا علاج دراصل اِنفاق سے ہوگا۔ انفاق فی سبیل اللہ یعنی اپنا مال اللہ کی راہ میں کھپانا' صدقہ و خیرات اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے مال لگانے سے نفاق کی کیفیت دُھلتی چلی جائے گی۔ نفاق کا اصل سبب حُبِّ دنیا ہے اور دنیا میں انسان کو سب سے زیادہ محبوب مال ہوتا ہے۔ سورۃ العادیات میں انسان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝۸﴾ ''اور یقیناً وہ مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔'' لہٰذا مال و دولت کو اللہ کے راستہ میں لگانے سے نفاق ختم ہوتا جائے گا۔

(۲) ایک اور چیز کا شعوری طور پر اہتمام کیجیے کہ جس وقت دین کا کوئی حکم انسان کے سامنے آجائے تو اس پر عمل میں تاخیر نہ کی جائے۔ یہ تاخیر درحقیقت نفاق کو جڑ پکڑنے کا موقع دیتی ہے۔ جب بھی دین کی کوئی بات سمجھ آجائے تو immediate action والا

انداز ہونا چاہیے‘ یعنی فوراً عمل کیا جائے۔ ایسی صورت حال میں عموماً شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ابھی تو یہ کام کرنا ہے‘ ابھی وہ ذمہ داری نبھانی ہے‘ اتنی جلدی کیا ہے! جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں سارا وقت دین کے لیے لگا دوں گا حالانکہ کس کو معلوم وہ وقت آئے گا بھی یا نہیں! پھر یہ کہ اس وقت تک تو انسان کی صلاحیتیں ختم ہونے پر ہوتی ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ انسان ریٹائرمنٹ کے بعد بھی فارغ نہیں ہو پاتا۔ بیٹے بیٹیوں کی ذمہ داری ادا کی تو پوتے‘ پوتیاں‘ نواسے‘ نواسیاں سامنے ہوتے ہیں۔ دنیاوی اُمور کا بوجھ تو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ ہونا تو بس یہی چاہیے کہ زندگی میں جس وقت بات سمجھ آجائے‘ اسی وقت عمل کا آغاز کر دیا جائے۔ ایسا نہ کرنے پر سورۃ الانعام میں بڑی شدید وعید آئی ہے:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾

’’اور ہم پلٹ دیتے ہیں ان کے دل اور آنکھیں‘ جیسے کہ وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے تھے‘ اور ان کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بہکے چلے جاتے ہیں۔‘‘

گویا انسان پر جب کوئی حقیقت منکشف ہو جائے تو فوراً تسلیم کر لے۔ کسی مصلحت‘ بزدلی‘ لالچ یا اختیار کی وجہ سے رُک گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیتِ حق کی استعداد سلب ہوتی جاتی ہے۔

صحابہ کرام ؓ کے واقعات اس حوالہ سے موجود ہیں جن سے ہم ان حقائق کو سمجھ سکتے ہیں۔ اُن پر بھی وقتی طور پر ضُعفِ ایمان کا حملہ ہوا ہے (معاذ اللہ! نفاق کا نہیں)۔ حضرت کعب بن مالک ؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنی کیفیت کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو کہ بہت طویل حدیث ہے اور بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ اس موقع پر کئی منافقین نے جھوٹے بہانے بنا کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر رسول اللہ ﷺ سے رُخصت لے لی۔ تین ایسے صحابہ بھی تھے جو مؤمن صادق تھے لیکن وقتی طور پر شیطان کے حملہ میں آ گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے واپس آئے تو اُن لوگوں کو بلوایا جنہوں نے

رُخصت بھی نہیں لی اور غزوہ میں گئے بھی نہیں تھے۔ ایک ایک کر کے پیشی ہوئی۔ جو منافقین تھے انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ ہماری تو پوری تیاری تھی‘ بس وقت پر ایسی مصیبت آ گئی کہ نہیں جا سکے۔ حضور ﷺ نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ جب حضرت کعب بن مالک ؓ کی باری آئی تو انہوں نے عرض کیا کہ زبان میرے پاس بھی ہے‘ جھوٹ میں بھی بول سکتا ہوں لیکن جھوٹ بول کر میں اِس وقت آپؐ کی ناراضگی سے تو بچ جاؤں گا مگر اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکوں گا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جتنا صحت مند میں اس زمانے میں تھا‘ پہلے کبھی نہیں تھا۔ راستہ کے لیے جتنا ساز و سامان میرے پاس تھا‘ اُتنا پہلے نہیں تھا‘ لیکن میرے نفس نے اور شیطان نے یہ پٹّی پڑھائی کہ رسول اللہ ﷺ تو تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ چلیں گے تو آہستہ ہوں گے۔ میرے پاس تو بہت ہی توانا اور صحت مند اُونٹنی ہے‘ میں دو دن گھر میں ٹھہر کر اہل و عیال کے ساتھ کھجور کے درختوں کی چھاؤں میں گزار کر تیزی کے ساتھ جاؤں گا اور حضور ﷺ سے جا ملوں گا۔ نیت میں کوئی خرابی نہیں تھی لیکن ہوا یہ کہ شیطان روز یہ بہانہ دل میں ڈال دیتا کہ لمبا سفر ہے‘ دو دن اور ٹھہر جاؤ‘ پھر اُونٹنی کو تیز دوڑا کر لشکر سے جا ملنا۔ کہتے ہیں کہ ہوتے ہوتے ایک دن ایسا آیا کہ مجھ پر منکشف ہو گیا کہ اب میں چاہے اُونٹنی کو کتنا ہی تیز دوڑا لوں‘ کتنا ہی تیز چل لوں‘ لشکر میں شامل نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو ان تینوں حضرات سے بائیکاٹ کا حکم دے دیا‘ یعنی معاشرتی مقاطعہ جو کہ بہت سخت سزا تھی۔ آخر کار ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ یہ بہت طویل حدیثِ مبارکہ ہے۔

یہاں پر جو اہم سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہی ہے کہ دین کا حکم سامنے آنے پر شیطان تاخیر کا حربہ ڈالتا ہے کہ ابھی کیا جلدی ہے‘ کچھ فارغ ہو جاؤ تو کر لینا‘ بعد میں اس کی تلافی کر لینا۔ لہٰذا ہمیں یہ عادت شعوری طور پر اپنے اندر پیدا کرنی ہے کہ جب بھی حقیقت واضح ہو جائے‘ فرض سمجھ آ جائے فوراً اعتراف کر لیا جائے کہ ہاں بات ٹھیک ہے۔ جب فرض کا احساس ہو جائے‘ فوراً اس کی ادائیگی کے لیے آغاز کر دیا جائے۔ تاخیر و تعویق سے نفاق کو آغاز کا موقع مل جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو حقیقی ایمان عطا فرمائے اور نفاق سے بچنے کی توفیق دے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁ ❁ ❁

سالانہ اجتماع کے مقاصد
اور
ان کے حصول کا طریقہ

بانیٔ تنظیم اسلامی کے ایک فکر انگیز خطاب سے ماخوذ

تنظیم اسلامی کے نویں سالانہ اجتماع منعقدہ ۲۵ مئی تا ۲۹ مئی ۱۹۸۴ء کے موقع پر بانیٔ تنظیم نے رفقاء سے جو مفصل افتتاحی خطاب ارشاد فرمایا تھا' اس میں جہاں دیگر بہت سے اہم ملی و ملکی اور تنظیمی و جماعتی موضوعات کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا وہاں اجتماع کے مقاصد پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی۔ ذیل میں ہم بانی محترم کی گفتگو کے اس حصے کو معمولی سے حِک واضافے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے اجتماع کے مقاصد کے حوالے سے گفتگو فرمائی تھی۔ اس لیے کہ اجتماع کے جو مقاصد اُس وقت تھے وہی آج بھی ہیں۔ (ادارہ)

اس اجتماع کے چار اہم مقاصد ہیں جو ہم میں سے ہر شخص کے سامنے شعوری طور پر رہنے چاہئیں۔

(۱) جذبۂ تازہ کا حصول

جب ہم یہاں سے جائیں تو جذبۂ تازہ لے کر جائیں۔ ہمارے اندر ایک نئی لگن پیدا ہو جائے۔ جہاں تک جذبے کا تعلق ہے تو اس کا تمام تر دارومدار ایمان پر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یقین جتنا گہرا ہوگا' اللہ تعالیٰ کے ہاں محاسبہ کا خوف جتنا زیادہ دامن گیر ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں جس قدر بڑھتی جائے گی' اس کی رضا جوئی کے لیے

تن من دھن لگانے کا جذبہ بھی اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا۔

دل میں ایمانِ حقیقی جاگزیں ہو چکا ہو تو انسان بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ دلوں پر بھی زنگ آ جایا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایمانی کیفیات دھندلانے لگتی ہیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا جِلَاءُهَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (رواہ البیہقی)

یعنی بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے سے۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ! اس زنگ کا علاج کیا ہے؟ فرمایا: ''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت ہی عملی سوال کیا۔ ان حضرات کا بالعموم انداز ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ علمی نوعیت کے مسئلوں میں نہیں پڑا کرتے تھے۔ ان کا یہ تجربہ تھا کہ تلواروں پر زنگ آ جائے تو صیقل کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دریافت کیا کہ دلوں کے زنگ کو کس چیز سے دور کیا جائے! دلوں کی ویران دنیا پھر سے کیسے آباد ہو جائے کہ جذبۂ ایمانی جھلملا اٹھے؟ آپ ﷺ نے جواباً دو چیزوں کا ذکر فرمایا: ایک موت کی بکثرت یاد کہ یہ احساس رہے کہ یہاں رہنا نہیں ہے بلکہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ گویا یہ دنیا ہماری منزل نہیں ہے بلکہ راہ گزر ہے۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کے یہ الفاظ بھی نہایت جامع ہیں جو آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان سے فرمائے تھے: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (رواہ البخاری والترمذی) یعنی ''دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا راہ چلتا مسافر!''

دوسری چیز جس کا آپ ﷺ نے باہتمام ذکر فرمایا' وہ ہے تلاوتِ قرآن۔ گویا اس زنگ کو اتارنے کے لیے یہ دو بہت ہی مؤثر ذریعے ہیں۔ اس اجتماع کا پہلا مقصد یہ ہوا کہ ان پانچ دنوں میں ہم نے اس زنگ کو اتارنا ہے جس کی وجہ سے ہمارا جذبہ سرد پڑ رہا

ہے۔ گویا کہ بیٹری کو ''ری چارج'' کرنا ہے۔

آپ لوگ اگر پورے صبر اور ہمت کے ساتھ مشکلات کو جھیلتے ہوئے خوش دلی سے اجتماع کے پروگراموں میں شریک رہیں تو ان شاء اللہ کسی نہ کسی درجے میں یہ مقصود ضرور حاصل ہوگا اور آپ اپنے جذباتِ ایمانی میں حرارت اور تازگی محسوس کریں گے۔

(۲) مقصد اور طریقِ کار کا شعور

ہمارے سامنے اپنے مقصد اور طریقہ کار کا شعور نکھر کر آئے اور مزید اُجاگر ہو‘ اس لیے کہ جس طرح دلوں پر زنگ آجایا کرتا ہے ایسے ہی ذہن بھی زنگ آلود ہو جایا کرتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان محسوس کرتا ہے کہ ذہن پر بھی کچھ غبار سا آ گیا ہے‘ جس کے نتیجے میں فکر کے خدوخال دھندلانے لگتے ہیں۔ اس زنگ کو اتارنے کے لیے اپنے مقصد اور طریق کار کا شعور ہونا ضروری ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ ہماری اِس دُنیوی جِدّوجُہد کا ہدف کیا ہے‘ ہم کس طرف جا رہے ہیں! یہ صورت ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ ع ''آہ وہ تیر نیم کش‘ جس کا نہ ہو کوئی ہدف!'' اگر کیفیت یہ ہو تو گویا بہت ہی مایوس کن علامت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کچھ لوگ کام تو کر رہے ہیں لیکن انہیں یہ شعور نہیں کہ ہمارا ہدف کیا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے اس سفر کی منزل کون سی ہے۔

مقصد کے شعور کے علاوہ منزل تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے‘ اس کا شعور بھی ذہنوں کے اندر برقرار رہنا چاہیے۔ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے بھانت بھانت کی بولیاں سنتا ہے‘ طرح طرح کے فلسفوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ مختلف نوعیت کی دعوتیں مختلف جانب سے اس کے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ لہٰذا کچھ شکوک وشبہات کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔ اس اجتماع کے موقع پر ہمیں اپنے مقاصد کے شعور کے ساتھ ساتھ طریقہ کار کو پورے مراحل و مدارج کے ساتھ از سرِ نو اُجاگر کرنا ہے۔

(۳) رفقاء کا باہمی تعارف

تیسرا مقصد اس قافلے کے ساتھ چلنے والے ساتھیوں کا باہمی ربط وضبط بڑھانا اور محبّتِ قلبی میں اضافہ کرنا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت میں رفقاء کا باہمی تعارف بہت ہی اہم ہوتا

ہے۔ اس اجتماع پر اللہ تعالیٰ نے اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس وقت ملک کے کونے کونے سے رفقاء تشریف لائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی سنہری موقع ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ربط وضبط بڑھائیں اور ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس دور میں دینی اخوت کو نبھانے کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ بقولِ شاعر ؎

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں!

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے مواقع ہر روز کہاں ملا کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں شکاگو اور ٹورنٹو سے بھی رفقاء آئے ہوئے ہیں‘ جو اپنے اپنے علاقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

(۴) نظم کی اہمیت کا ادراک

ہمیں نظم وضبط کی اہمیت کا ادراک ہو۔ چونکہ ہم ایک منظّم جماعت کے تحت منظّم جِدّوجُہد کر رہے ہیں‘ لہٰذا اس کام میں نظم کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو مَیں اس موقع پر دروسِ قرآن و حدیث کے ذریعے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔ نظم کی اہمیت کے ضمن میں جو آیات و احادیث بیان ہوتی ہیں‘ وہ ہر رفیق کے سامنے آئینہ کی طرح ہونی چاہئیں۔ اس نظم وضبط یا ڈسپلن کی اہمیت کے ادراک کا علمی پہلو اپنی جگہ بہت زیادہ اہم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں نظم وضبط کو عمل (practice) میں بھی لانا چاہیے‘ یعنی ہم نظم کے خوگر بن جائیں۔ ہمارا نظم مثالی ہونا چاہیے۔ دیکھنے والے خدانخواستہ ایسا محسوس نہ کریں کہ یہ کوئی منظّم جماعت نہیں‘ ایک ہجوم ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

اس اجتماع کے موقع پر بھی نظم وضبط کا بھرپور مظاہرہ ہونا چاہیے۔ اجتماع کے منتظمین سے اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو ان پر نکیر کرنے کی بجائے خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ

ان کی توجّہ اس جانب مبذول کرانی چاہیے۔ ہمیں اپنے رفقاء کے بارے میں کسی بھی درجے میں سُوءِ ظن میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ انہوں نے جان بوجھ کر آپ کے لیے کوئی تکلیف دہ صورتحال پیدا کر دی ہے۔ اس طرح کے کسی بھی خیال کو ذہن میں نہ آنے دیجیے۔ خود آپ لوگوں کی طرف سے کوئی بدنظمی صادر نہ ہو۔ یہ بھی آپ کی تربیت کا ایک اہم حصّہ ہے۔

مقاصد کے حصول کا ذریعہ

پہلے دو مقاصد کے حصول کے لیے ہمارا ذریعہ (source) قرآن ہے‘ جو ہمارا ہادی و رہنما ہی نہیں سرچشمۂ ایمان بھی ہے۔ یہی قرآن ہمیں ان مقاصد کا شعور عطا کرنے والا ہے اور یہی ہمیں ان کے حصول کا طریقِ کار بتانے والا ہے۔ نظمِ جماعت کس طور کا ہو‘ اس کی طرف ہماری رہنمائی کرنے والا بھی یہی قرآن ہے۔ آپ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب میں لفظ ’’قرآن‘‘ کہتا ہوں تو اس وقت میرے ذہن میں قرآن متلو کے ساتھ‘ جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں اور جو مصحف کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے‘ قرآنِ مجسّم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن اور ذاتِ رسول ﷺ بریکٹ ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس قرآن کی توضیح و تشریح آپ ﷺ نے اپنے قول سے بھی کی ہے اور اس کے دیے ہوئے مقاصد کے حصول کے لیے ایک عملی جدّ و جُہد آپ ﷺ نے بالفعل کر کے بھی دکھائی ہے۔ اس عملی جدّ و جُہد کے تمام مراحل و مدارج ہمیں سیرتِ مطہرہ میں ملتے ہیں۔ گویا یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے میں آپ کی توجہ سورۃ البیّنہ کی ابتدائی آیات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝١ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝٢ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝٣﴾

’’نہیں تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے الگ

ہونے والے (یا باز آنے والے) جب تک کہ ان کے پاس البیّنہ نہ آ جاتی۔ ایک رسول (ﷺ) اللہ کی جانب سے جو تلاوت کرتا ہے پاکیزہ اوراق کی۔ ان میں بڑے مضبوط احکام (تحریر) ہیں۔‘‘

وہ بیّنہ اللہ کی جانب سے ایک رسول ہیں‘ جو ان پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ گویا رسولؐ اور کتاب مل کر ایک بیّنہ یعنی ایسی روشن دلیل جو حُجّتِ قاطع بن جائے‘ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو مقصد کے شعور اور ایمان کی جلا کا واحد ذریعہ ہی یہ ہے۔ ہمیں طریق کار اور اس کے مراحل کا شعور بھی وہیں سے حاصل کرنا ہے۔

اس اجتماع کا جو تیسرا مقصد ہے‘ اس کے حصول کے لیے آپ کو خصوصی طور پر وقت نکالنا ہوگا۔ اپنے نفس کے ناگزیر حقوق کی ادائیگی یعنی کھانے‘ پینے اور بقدرِ ضرورت سونے کے بعد جو وقت بھی فارغ ملے اور ان بھاری بھرکم پروگراموں سے جو وقت بچ جائے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کریں۔ یہ اس وقت کا بہترین مصرف ہوگا۔ ایک مختصر سا تعارف تو آپ کو رفقاء کے سینوں پر آویزاں بیجوں (badges) سے حاصل ہو جائے گا‘ لیکن اس کے علاوہ اپنے رفقاء کے حالات معلوم کرنا اور ان سے ذاتی تعلق بڑھانا بھی ضروری ہے۔ گویا فارغ اوقات میں آپ اپنے ہم مقصد ساتھیوں کا تفصیلی تعارف حاصل کریں تاکہ باہم محبّت میں اضافہ ہو۔

اللہ کی خاطر باہم محبّت رکھنے والوں کے لیے بشارتیں

کسی بھی اجتماعیت کے لیے آپس کا میل جول اور باہمی محبّت بہت ہی ضروری ہوتی ہے۔ ہماری اس چھوٹی سی اجتماعیت میں اخوتِ باہمی کی فضا پیدا ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے ان احادیث مبارکہ کو ذہن میں رکھیے کہ جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان مومنین کے لیے جو دین کی خاطر ایک دوسرے سے محبّت رکھتے ہوں‘ بشارتیں سنائی ہیں۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

((وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِينَ

فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ)) (رواہ مالک و احمد)

یعنی میری محبّت ان لوگوں کے حق میں واجب ہوگئی جو صرف میرے لیے ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہیں‘ اور جو میری خاطر مل جل کر بیٹھتے ہیں‘ اور جو میرے لیے ایک دوسرے کو ملنے آتے ہیں اور جو میری محبّت میں ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔

اس حدیث مبارکہ میں جو لفظ ’’فِیَّ‘‘ آیا ہے اس کا کوئی مجرد تصوّر اپنے ذہن میں نہ رکھیے۔ یہاں ’’اللہ کے لیے محبّت‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین کے لیے اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کا جذبہ۔ گویا غلبۂ دین کے لیے ایک منظّم جِدّوجُہد ہو رہی ہے‘ ایک قافلہ ہے اور اس کے ساتھ کچھ لوگ شریک ہیں۔ اب اس قافلے میں چلنے والے کچھ پرانے ساتھی ہیں اور کچھ نئے بھی ہیں‘ ان میں سمجھ دار بھی ہیں اور ناسمجھ بھی ہیں۔ اس قافلے کے وہ ہم سفر کہ جو بہت عرصہ پہلے سے شامل ہیں‘ ان پر بہت سے حقائق واضح ہیں جبکہ جو اس قافلے میں نئے ہم سفر ہیں‘ انہیں ابھی بہت سی چیزوں کا شعور نہیں ہے۔ پھر ان میں وہ بھی ہیں جنہیں دوسری تنظیموں اور جماعتوں میں کام کرنے کا کوئی تجربہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس قافلے میں شامل افراد کو جوڑنے والی چیز ایک مقصد کی لگن اور احساسِ فرض ہے۔ اسی کے تحت یہ قافلہ قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اب ’’فِیَّ‘‘ کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سورۃ العنکبوت کی آخری آیت بہت مدد و معاون ہوگی۔ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ اس مقام پر ’’فِیْنَا‘‘ کے معنی ہیں: ’’فِی سَبِیْلِنَا‘‘ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں‘ ہماری طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں مجاہدہ کریں گے‘ ایثار و قربانی اور صبر کا مظاہرہ کریں گے‘ ان سے پختہ وعدہ ہے کہ ہم لازماً انہیں اپنے راستے دکھائیں گے اور ان کے لیے ان راستوں کو کھولتے چلے جائیں گے۔

گویا پہلے انہیں محسوس ہوگا کہ جیسے ان پر راستے کے نشانات پوری طرح واضح نہیں ہیں‘ تاہم فرض کی ادائیگی کے تحت سفر کا آغاز کر دیں گے‘ لیکن اس راستے پر جیسے جیسے آگے بڑھیں گے‘ وہ یہ محسوس کریں گے کہ جیسے کوئی انگلی پکڑ کر چلا رہا ہے اور کوئی ہمارے

سامنے منزل کو دن بدن اجاگر کرتا چلا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث مبارکہ میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے باہمی محبّت کرنے والوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي؟ الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي)) (رواہ مسلم ومالک)

یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ: کہاں ہیں وہ لوگ جو میری جلالت شان کے لیے ایک دوسرے سے محبّت کرتے تھے؟ آج کے دن مَیں انہیں اپنے سائے میں پناہ دوں گا‘ آج میرے اس سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے! بعض دوسری روایات میں ’’فِیْ ظِلِّ عَرْشِیْ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں کہ مَیں انہیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا‘ لیکن یہاں تو اس درمیانی واسطے کو بھی علیحدہ کر کے ’’ظِلِّی‘‘ یعنی اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دوں گا‘ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

احادیث میں وارد شدہ ان بشارتوں کو سامنے رکھ کر اپنے فارغ اوقات کو باہمی تعارف اور میل جول میں صرف کیجیے۔ اس کام میں جو وقت بھی صرف ہو‘ اسے نہایت قیمتی سمجھیے کہ یہ ہرگز رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ اگر آپ ان چار مقاصد کو سامنے رکھ کر پوری دلچسپی‘ انہماک اور نظم وضبط کے ساتھ اجتماع کے پروگراموں میں شریک ہوں گے تو نہ صرف یہ کہ طریقِ کار اور منہجِ عمل کے بارے میں اگر کوئی ابہام آپ اپنے ذہنوں میں لے کر آئے تھے وہ ازخود رفع ہو جائے گا بلکہ آپ ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اس اجتماع سے رخصت ہوں گے۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِھٰذَا!

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اقامتِ دین کے مطالبات

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

یہ جماعت اسلامی ہند کے رہنما مولانا رضی الاسلام ندوی ﷾ کا ایک اہم خطاب ہے۔ اس کے مخاطبین تو ارکانِ جماعت ہیں لیکن اس میں دیگر اسلامی تحاریک، خصوصاً رفقاء تنظیم اسلامی کے لیے بھی رہنمائی کا کافی سامان موجود ہے۔ اس لیے اسے معمولی حک و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ اسے جناب سلیم منصور خالد کی مرتب کردہ کتاب ''اقامتِ دین: روایت، عمل، رہنمائی'' سے لیا گیا ہے۔ (ادارہ)

پانچ تقاضے ہیں، جن کا ہمارا یہ نصب العین ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ ان باتوں کا مخاطب سب سے پہلے میں خود اپنی ذات کو سمجھتا ہوں، پھر آپ حضرات کے سامنے یہ باتیں پیش کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ ہم میں سے ہر شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ان باتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھے گا اور ان تقاضوں کا خود کو مخاطب سمجھے گا اور ان پر حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کرے گا:

(۱) اقامتِ دین کا درست تصوّر

سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنا تصور درست کریں۔ اقامتِ دین صرف سیاسی اسلام کا نام نہیں ہے۔ جماعت کے تصورِ اقامتِ دین کو بدنام کرنے کے لیے اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے ایک الزام بہت زور وشور سے یہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ سیاسی اسلام کے داعی ہیں۔ یہ الزام اسلام کے مخالفین نے بھی لگایا ہے۔

چنانچہ مغرب میں مولانا مودودیؒ کی شخصیت اور فکر پر جو سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اس چیز کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے کہ انہوں نے سیاسی اسلام کی دعوت دی ہے۔ یہاں تک کہ ایک اصطلاح مغرب میں استعمال ہونے لگی ہے ''مودودی ازم''، یعنی اس شخص کے افکار نے اسلام کو سیاسی طور پر غالب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو عام کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ پر مغرب میں جتنی کتابیں مثبت انداز میں لکھی گئی ہیں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں کتابیں اور مقالے منفی انداز میں لکھے گئے ہیں اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے ''سیاسی اسلام'' کی دعوت پیش کی۔ یہ بات صرف غیر مسلم مصنّفین اور مستشرقین نے ہی نہیں کہی ہے، بلکہ افسوس ہے کہ یہ بات کہنے والے بہت سے مسلمان بھی ہیں، چاہے وہ عالمِ عرب کے بعض مسلم مصنّفین ہوں یا برصغیر پاک و ہند کے بعض علماء اور دانش ور ہوں۔

ان تمام معترضین کو شکایت ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اسلام کا جو جامع تصور پیش کیا ہے، اس میں سیاست کو کیوں شامل کیا ہے؟ ان معترضین کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بھی جماعت کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ سیاست کی بات کرتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حکومت چاہتے ہیں، دنیاداری کے خواہاں ہیں، دنیا کمانا چاہتے ہیں، اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ یہ تصور شعوری یا غیر شعوری طور پر جماعت کے بعض وابستگان میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاست میں عمل دخل، اقتدار حاصل کرنے کی خواہش اور حکومت بنانے کی کوشش، یہی اقامتِ دین کا کام ہے، حالانکہ اقامتِ دین کا مطلب یہ نہیں ہے۔

اقامتِ دین میں تین باتیں کہی گئی ہیں: فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل۔ فرد کی اصلاح اور معاشرے کی تعمیر کے بغیر ریاست کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ریاست کی تشکیل کا نام اقامتِ دین ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اقامتِ دین کا تصور غلط ہے۔

اقامتِ دین کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنا تصور درست کریں۔ اقامتِ دین کا مطلب کیا ہے؟ اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں؟ اس کے مراحل کیا ہیں؟ اس کا ہمیں صحیح طریقہ سے علم ہونا چاہیے۔ تصوّرِ اقامتِ دین پر دوسرے حلقوں سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے سلسلے میں ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا غلبہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، اس کے لیے جدّ و جُہد مطلوب نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ میں دین سے مراد صرف ایمانیات اور اخلاقیات ہیں، اس کے لیے اجتماعی جِدّ و جُہد مطلوب نہیں ہے۔ تمام احکام کا خطاب اللہ کے بندوں سے انفرادی طور پر ہے۔

اس طرح کے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے سلسلے میں ہمارا ذہن بالکل واضح ہونا

چاہیے۔ یہ اعتراضات غلط ہیں اور کیوں غلط ہیں؟ ان کے غلط ہونے کے دلائل کیا ہیں؟ اس کے بارے میں ہمارا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے۔ اگر ہمارا ذہن صاف نہیں ہوگا تو ہم اس راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتے‘ اس لیے کہ جب ہمارا تصور ہی واضح نہیں ہوگا تو ہم کیسے اسلام کی راہ میں پیش قدمی کر سکتے ہیں؟

(۲) دین کا اپنی ذات پر نفاذ

اقامتِ دین کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اقامتِ دین کا اوّلین نفاذ ہماری ذات پر ہونا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد خود کو مخاطب سمجھے۔ دین کی تمام تعلیمات ہمارے لیے آئی ہیں۔ چاہے عبادات کا معاملہ ہو‘ ذکر و صلوٰۃ‘ زکوٰۃ‘ روزہ اور ان میں فرائض‘ نوافل‘ معاشرت کا پہلو ہے‘ جتنے حقوق العباد ہیں‘ معاملات‘ اخلاقیات۔ دین کے یہ جتنے پہلو ہیں ان کا اوّلین خطاب ہم سے ہے۔ ہم کو ان تعلیمات‘ ہدایات اور احکام کو اپنی ذات پر نافذ کرنا ہے۔

اس تعلق سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت پیش کی۔ آپؐ نے اسلام کا پیغام عام کیا۔ ایک ایک کر کے لوگ آپؐ پر ایمان لاتے گئے۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جمعیت وجود میں آ گئی۔ سب سے پہلے دین ان پر نافذ ہوا۔ کیا صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک شخص کے بارے میں بھی ان کے مخالفین نے یہ بات کہی کہ یہ لوگ جس اسلام کے دعوے دار ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے؟ یہ امانت کی بات کرتے ہیں‘ لیکن بے ایمانی ان کا شیوہ ہے۔ یہ حقوق کی بات کرتے ہیں‘ لیکن دوسرے انسانوں کے حقوق ہڑپ کر لیتے ہیں۔ یہ معاملات میں شفافیت کی بات کرتے ہیں‘ لیکن ان کے اپنے معاملات انتہائی خراب ہیں!

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مختلف اعتراضات کیے گئے: یہ ساحر ہیں‘ کاہن ہیں‘ شاعر ہیں‘ یہ بھائی بھائی میں جدائی ڈالتے ہیں! لیکن کیا کسی معترض کو یہ کہنے کا یارا ہوا کہ ان پر جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اتنی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان کی باتوں پر کما حقہٗ عمل نہیں کرتے۔ کسی ایک فرد کے بارے میں بھی یہ اعتراض نہیں کیا گیا۔

اقامتِ دین کی ترتیب یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے دین کو اپنے اوپر نافذ کریں۔ اقامتِ دین کا اولین ٹارگٹ ہماری ذات بنے۔ جماعتِ اسلامی کے ارکان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ کارکنان و متفقین اور وابستگان کی تعداد لاکھوں میں ہوگی۔ اگر ہم اس بات کو یقینی بنا دیں کہ

اتنے افراد سب سے پہلے دین کو اپنی ذات پر قائم کریں گے تو اس کا مطلب ہے کہ اتنے انسانوں پر دین قائم ہو گیا۔ اب یہ لوگ دوسرے انسانوں تک دین کی تعلیمات پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہم میں سے ہر مرد‘ ہر عورت‘ جماعت کا ہر رکن‘ ہر کارکن اس بات کو یقینی بنائے کہ اس کی ذات پر دین قائم ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے اپنے اوپر دین قائم کرنے کے بجائے دوسرے لوگوں پر دین کو قائم کرنے کی کوشش کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ترتیب الٹ دی۔ الٹی ترتیب سے دین کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ صحیح ترتیب یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنے اوپر دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

(۳) گھر اور خاندان کے دائرے میں کام

اقامتِ دین کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے گھر اور خاندان کے دائرے میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم اپنے گھر کے قوّام ہیں‘ ہمیں ’’راعی‘‘ کہا گیا ہے۔ راعی کے معنی چرواہا کے ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک چرواہے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کی نگرانی میں جو بھی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہے‘ ان کی حفاظت کرے‘ بھیڑیوں کے حملوں سے ان کو بچانے کی کوشش کرے‘ ان کے چارہ پانی کا انتظام کرے‘ ان کی صحت کا خیال رکھے‘ ان کو تکلیفوں سے بچائے۔ اسی طرح ہم میں سے ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے اہلِ خانہ پر پوری توجہ دیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے۔‘‘

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝۲۱۴﴾ (الشعراء)

’’اور خبردار کرو اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو۔‘‘

یہ حکم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت کے ابتدائی زمانے میں دیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں جو بھی خفیہ دعوت‘ انفرادی دعوت کا تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم پر عمل کیا۔ آپؐ نے اپنے خاندان والوں کو بلایا۔ قریش کے چھوٹے بڑے تمام خاندان والے اکٹھا ہوئے۔ آپؐ

نے انہیں مخاطب کیا: ''اے بنی فہر! اے بنی لوی! اے بنی ہاشم!'' آپؐ نے قریش کے ایک ایک خانوادے کا نام لے کر فرمایا: ''تم مجھ سے جو کچھ دنیا کی چیزیں مانگنا چاہو مانگ لو' میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا' لیکن مَیں تمہیں آخرت کے بارے میں ڈرانا چاہتا ہوں۔ آخرت میں ہر فرد ذاتی حیثیت میں جواب دہ ہوگا' تم اس کے بارے میں فکر کرلو۔'' پھر آپؐ نے خاندان سے آگے بڑھ کر اپنے رشتہ داروں کا نام لیا: ''اے میری پھوپھی صفیہ! اے میری بیٹی فاطمہ! مَیں تمہیں آخرت کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔''

یہ تلخ حقیقت ہے' لیکن ہمیں اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم جماعت میں تنہا شامل ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے گھر والوں کو شامل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ گھر والوں کو شامل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کو بھی جماعت کی رکنیت کا فارم بھروا دیں' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے گھر والے ہمارے ہم خیال بنیں۔ وہ ہمارے کاموں میں رکاوٹ نہ ڈالیں' بلکہ معاون بنیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔

ہم اپنے بچوں کا نکاح کرتے ہیں تو آسان نکاح کی ہماری ساری تقریریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ ہمارے خاندان والے ہی رکاوٹ ڈالتے ہیں: یہ ہمارا پہلا بیٹا ہے' یہ ہماری آخری بیٹی ہے' ہمیں ارمان نکالنے ہیں' اب دوبارہ اس کا موقع نہیں آئے گا۔ اس طرح کی باتیں خاندان والوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں۔ ہم خواہش رکھتے ہیں کہ نکاح کو اسلامی طریقے سے کرنے کی کوشش کریں گے' لیکن اپنے خاندان ہی میں ہم اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں۔ جہیز کے بارے میں ہم تقریریں کرتے ہیں کہ جہیز ایک لعنت ہے' اس کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے' یہ ہندووانہ رسم ہے' لیکن جب ہماری اپنی بیٹی کے نکاح کا موقع آتا ہے تو چاروناچار ہمیں جہیز دینا پڑتا ہے۔ لڑکے کے نکاح کا موقع آتا ہے تو ہم صراحت سے جہیز کا انکار نہیں کر پاتے ہیں۔ ہمارے بیٹے' بیٹیاں' بیویاں اور دوسرے رشتے دار اصرار کر کے ہم سے وہ کام کروا لیتے ہیں' جنھیں انجام دینے پر ہم آمادہ نہیں ہوتے۔ قرآنِ مجید میں وراثت کی تقسیم کا صریح حکم دیا گیا ہے' لیکن ہم اس پر عمل نہیں کر پاتے۔ وراثت میں ہم اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دے پاتے۔ عائلی تنازعات تحریکِ اسلامی کے خاندانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ساس بہو کے جھگڑے جماعتِ اسلامی کے ارکان اور وابستگان کے درمیان بھی موجود ہیں۔ مَیں بہت معذرت کے

ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری توجہ گھر سے باہر زیادہ رہتی ہے' گھر کے اندر کم رہتی ہے۔ اس وجہ سے جب ہمارا انتقال ہوتا ہے تو ہمارے گھر سے بھی تحریک کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تحریک میں تنہا شامل ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے خاندان کو شامل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ہماری بہنیں سوال کرتی ہیں کہ اقامتِ دین کا خطاب ہم سے کس طرح ہے؟ ہم کیا کریں؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ اپنے گھر میں اسلام کو نافذ کیجیے۔ آپ خود دین پر عمل کیجیے اور اپنے بچوں کی اس طرح تربیت کیجیے کہ وہ بھی دین پر عمل کریں۔ آپ اپنے شوہروں کی معاون بنیے۔ ان کو خوش گوار ماحول فراہم کیجیے۔ گھر کے اندر ان کو سکون فراہم کیجیے' تاکہ وہ گھر کے باہر دین کا کام کرسکیں۔ اگر آپ یہ سب کرلیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے اقامتِ دین کا کام پورا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبۃ: ۷۱) ''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔''

'اولیاء' کہتے ہیں قریبی تعلق رکھنے والوں کو۔ عام دوستوں اور عام تعلق رکھنے والوں کے بارے میں اولیاء کا لفظ نہیں آتا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں آتا ہے جن کے درمیان انتہائی گہرا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر معروفات کا حکم دیں اور منکرات سے روکیں۔ جس طرح مرد کو اپنے گھر کا ذمہ دار کہا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی ذمہ دار (راعیۃ) کہا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں اور بچوں کی نگران ہوتی ہے۔

(۴) اجتماعیت کو اختیار کریں

اقامتِ دین کا ہم سے چوتھا تقاضا یہ ہے کہ ہم دین کی تبلیغ اور اشاعت میں اجتماعیت کو ملحوظ رکھیں۔ دین (کے بعض احکام) پر انفرادی طور سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ نماز کوئی شخص تنہا پڑھ لے' نماز ہو جائے گی۔ وہ مسجد نہ جائے' جماعت میں شامل نہ ہو' گھر پر ہی نماز پڑھا کرے تو قانونی طور پر اس کی نماز ہو جائے گی۔ اس پر زکوٰۃ فرض ہے' وہ کسی کو زکوٰۃ دے دے' ایک آدمی کو دے دے یا دس آدمیوں کو دے دے' اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ لیکن دین کی تعلیم یہ ہے کہ ہر عمل اجتماعی طور سے ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دین پر عمل کے لیے جتنے احکام دیے

گئے ہیں سب کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور اشاعت کے سلسلے میں بھی اجتماعیت کو اختیار کیا جائے۔

تصورِ اقامتِ دین کے مخالفین کہتے ہیں کہ دین کے احکام پر عمل افراد سے انفرادی طور پر مطلوب ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ مفسّرین نے صراحت سے یہ بات کہی ہے کہ دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اجتماعی جِدّ و جُہد مطلوب ہے۔ اس موقع پر مَیں صرف دو مفسّرین کے حوالے دوں گا: ایک قدیم مفسّر ہیں علامہ ماوردیؒ۔ پانچویں صدی سے ان کا تعلق ہے۔ ۴۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ بہت عظیم مفسّر ہیں، فقہ میں بھی ان کا کام ہے۔ ان کی تفسیر کا نام ہے: ''النکت والعیون'' جو تفسیر الماوردی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ انہوں نے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی تفسیر میں لکھا ہے: ''اقامتِ دین کے دو پہلو ہیں: پہلا یہ کہ خود دین پر عمل کرو۔ دوسرا یہ ہے کہ اس کی طرف دوسروں کو دعوت دو۔'' دوسرے مفسر موجودہ دور کے ہیں۔ عالمِ عرب کے ممتاز عالم عبدالرحمٰن السعدی کی تفسیر کا نام ہے: ''تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان۔'' اس میں انہوں نے آیتِ شوریٰ کی تفسیر میں لکھا ہے: ''دین کو تم اپنی ذات پر قائم کرو اور اسے دوسروں پر بھی قائم کرنے کے لیے جِدّ و جُہد کرو۔ نیکی اور تقویٰ کے معاملے میں دوسروں سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں دوسروں سے تعاون نہ کرو۔'' یہ میں نے دو مفسرین کے حوالے دیے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مفسّرین نے بھی یہ بات کہی ہے کہ دین کی دعوت و اشاعت کے لیے اجتماعی جِدّ و جُہد مطلوب ہے۔

(۵) منزل پر نظر رہے!

پانچواں تقاضا اقامتِ دین کا یہ ہے کہ منزل پر ہماری نظر ہو۔ ہمیں معلوم ہو کہ ہماری منزل کہاں ہے؟ اور کیا راستہ ہمیں اختیار کرنا ہے؟ راستے میں چاہے جتنی رکاوٹیں آئیں، ہم رکاوٹوں کو دور کریں گے، لیکن ہر لمحے منزل پر ہماری نظر ہوگی۔ سیرتِ نبویؐ سے ہمیں اس سلسلے میں بہت اہم راہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے بعد ابتدائی زمانے میں جب مشرکین مسلمانوں کو ستانے لگے، تکلیف پہنچانے لگے تو حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ ہمیں مشرکین بہت تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے دعا

کر دیجیے اور ان لوگوں کے لیے بددعا کر دیجیے کہ یہ لوگ ہلاک ہو جائیں۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ آپؐ نے جب یہ بات سنی تو اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خباب! تم ابھی سے گھبرا گئے۔ تم سے پہلے کے لوگوں کو اتنا ستایا گیا کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کی کھال اتار لی گئی، طرح طرح سے ان کو ستایا گیا۔'' آپؐ نے اس کی مثالیں دیں، پھر آخر میں فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ معاملہ جو مَیں لے کر آیا ہوں، یہ دین جو لے کر آیا ہوں پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک جائے گا، اس کو اللہ کے علاوہ اور کسی کا خوف نہیں ہوگا، لیکن تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔''

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب مدینہ کے اطراف میں خندق کی کھدائی ہو رہی تھی تو کئی چٹانیں ٹوٹ نہیں رہی تھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کو خبر دی گئی۔ آپ تشریف لے گئے۔ آپؐ نے کلہاڑی ماری۔ چٹانیں پاش پاش ہوگئیں۔ چٹانوں سے چنگاریاں نکلیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان چنگاریوں میں مجھے قیصر و کسریٰ کے محلات نظر آتے ہیں۔'' یہ ہے منزل کا شعور کہ آنکھوں سے منزل دکھائی دینے لگے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو حکم دیا گیا: ''اے پیغمبر! آپ اعلان کر دیجیے اور اپنی دعوت میں کسی مداہنت کا معاملہ نہ کیجیے، مشرکین سے اعراض کیجیے، اپنی دعوت کو برملا پیش کیجیے۔'' چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ مشرکین نے آپؐ سے سودا کرنا چاہا۔ آپؐ کے چچا ابوطالب آپؐ کے سرپرست تھے۔ ان کے پاس گئے اور کہا کہ کسی طرح اپنے بھتیجے کو اس طرح دعوت پیش کرنے سے روکیے۔ یہاں تک کہ ابوطالب بھی کچھ دیر کے لیے متزلزل ہو گئے۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ اُمید رکھیں کہ مَیں اس دعوت کو چھوڑ دوں گا تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب کر دے، یا مَیں اسی راہ میں کام آ جاؤں۔''

ہمارے راستے میں بہت سی رکاوٹیں آتی ہیں، لیکن ہر حال میں ہماری نظر منزل پر ہونی چاہیے۔ اسے دیکھتے ہوئے ہم ایک ایک قدم آگے بڑھائیں گے تو منزل پر ضرور پہنچیں گے، لیکن اگر منزل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، راستے سے ہم ہٹ گئے تو منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری رفتار چاہے جتنی سست ہو، لیکن اگر ہمیں راستے کا پتہ ہے تو یقیناً ہم منزل سے قریب ہوتے جائیں گے۔ (تلنگانہ میں کارکنوں سے خطاب) ❁❁❁

تزکیۂ نفس

ایوب بیگ مرزا

جب کوئی بچہ مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولتا ہے یا کوئی غیر مسلم کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پڑھتا ہے اور اعلانیہ طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو کچھ ضوابط اور قوانین کی پابندی اُس پر خود بخود لازم ہو جاتی ہے‘ جسے اسلامی شریعت کہا جاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ شریعت کے فلاں ضابطے اور قانون کو اُس کا دل یا دماغ تسلیم نہیں کرتا۔ گویا مسلمان ہونے کے لیے مکمل سرنڈر مطلوب ہے۔ البتہ خالصتاً ایسے امورِ دنیا کی بات الگ ہے جن سے کسی طرح بھی اور کسی انداز میں بھی شریعت کا تصادم نہ ہو رہا ہو۔ یعنی ایک مسلمان کا طرزِ زندگی ع ’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے‘‘ کی عملی مثال ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اصلاً اللہ کی رضا مطلوب ہے۔ اللہ راضی ہو تو دنیا کی کسی قوت اور طاقت کی کوئی حیثیت نہیں‘ سب ہیچ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا کیسے حاصل کی جائے! فوری طور پر سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے کہ مسلمان ہونے پر کچھ فرائض تو خود بخود لاگو ہو جاتے ہیں‘ مثلاً نماز اور روزہ کی پابندی‘ صاحبِ نصاب ہونے پر زکوٰۃ کی ادائیگی اور زادِ راہ ہونے پر حج کا فریضہ ادا کرنا؛ پھر یہ کہ حقوق العباد کی ادائیگی کی کم از کم قانونی طور پر ادائیگی ہو‘ مثلاً دھوکا‘ فریب‘ جھوٹ‘ ناحق کو حق بنا لینا یا کسی نوع کا ایسا تجاوز جس سے چاہے کوئی دوسرا بھائی متاثر نہ بھی ہو یعنی صرف اپنی حد سے آگے بڑھنا۔ اِن سب سے اجتناب تو شرعی فریضہ ہے۔ اِن سے آگے بڑھ کر اخلاقی سطح پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی منازل طے کرتے ہوئے انسانی اور اسلامی تقاضوں کے حصول کو اپنا ہدف بنا لینا‘ مثلاً نفلی نمازیں اور روزے‘ فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی خیرات اور عوامی بہبود کے امور سرانجام دینے میں جان اور مال کی دلی آمادگی‘ سنّتِ رسول ﷺ کو دانتوں سے پکڑ لینا اور اس سے انحراف کا تصور بھی نہ

رکھنا۔ اصطلاحی طور پر اسے تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر خود اپنے اعمال کی صفائی اور دھلائی میں ہر دم مشغول رہے۔ اِس حوالے سے مکمل طور پر اپنی ذات کو غور و فکر کا محور بنائے۔ ظاہری اور باطنی معاملات کے حوالے سے اپنا جائزہ لے اور خود کو اپنی ہی تنقید کی زد میں رکھے۔ دوسروں کے معاملات پر بھی غور کرے تو اُس سے اپنی بہتری اور اصلاح کا راستہ ڈھونڈے۔ دوسروں کو گنجائش دے اور حُسنِ ظن رکھے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایسا سب کچھ کر کے کیا اُس نے تمام دینی تقاضے پورے کر دیے! اِس سے بھی آگے بڑھ کر اُس نے عام لوگوں کو نیک اعمال کی ادائیگی‘ بُرے کاموں سے بچنے کی تلقین کر دی اور ایک اچھے واعظ کا رول ادا کر دیا۔ یوں اُس کی طرف سے تو حق ادا ہو گیا اور وہ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ کہہ کر مکمل طور پر بریُ الذمہ ہو گیا۔ اب دنیا جانے اور دنیا والے جانیں! اُس سے ذاتی سطح پر جو ہو سکا‘ اُس نے کر دیا‘ اُس کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اگر کسی مسلمان کے ساتھ ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے جو کوئی فرد‘ معاشرہ یا ریاست کر رہی ہے تو ایسے میں وہ زاہد و عابد کسی کو ظلم و ستم سے کیسے بچائے؟ اُس کے پاس تو طاقت نہیں ہے‘ وہ زیادہ سے زیادہ اظہارِ افسوس ہی کر سکتا ہے۔ کسی شہری کو ظلم و ستم سے بچانا فرد کا نہیں بلکہ ریاست کا کام ہے۔ اگر خود ریاست ہی ظلم و ستم ڈھا رہی ہے تو پھر مظلوم کہاں جائے؟

اِس سوال کا جواب اُس زاہد و عابد اور تزکیۂ نفس کی منازل طے کرنے والے کے پاس ہرگز نہیں ہے۔ اُس کا موقف ہو گا کہ ریاست اگر ایسا کر رہی ہے تو اُس کا واحد حل اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ انفرادی کارگزاری کی حدود یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن‘ اور یہ بہت بڑا ’’لیکن‘‘ ہے کہ عدل کو دین اسلام کا ’’کیچ ورڈ‘‘ کہا جاتا ہے۔ اگر اسلام سے عدل کو نکال دیا جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔ البتہ اس کے حوالے سے بھی ایک انتہائی نیک اور پارسا فرد بھی تلملانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ درحقیقت ماضی میں اسلامی ریاست کے وجود نے یہ تصور دیا تھا کہ تمام اجتماعی معاملات حکومت نے سنبھال لیے ہیں‘ وہ اپنے فرائض ادا کر رہی ہے اور جزا و سزا کا سلسلہ برحق چل رہا ہے تو ایسے میں فرد کی ضرورت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ شب و روز اللہ تعالیٰ کے حضور انہماک سے رکوع و سجود میں مصروف رہے‘ یہاں تک کہ کسی حد تک اپنی ذات سے بھی بے پروا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ محض ذاتی تزکیہ کے حصول میں کوشاں رہے۔ ظاہری طور پر یہ

بات اگرچہ بالکل درست ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ خلفائے راشدین کے دور کے بعد عوامی نقطہ نظر سے چند زریں اور سنہرے ادوار چھوڑ کر عوام عدل سے محروم ہی رہے۔ حکومت کا ناقد ریاست کا باغی سمجھا جاتا تھا اور یوں بدترین سزا کا حق دار قرار پاتا۔

راقم کہنا یہ چاہتا ہے کہ خود کو محض ذاتی تزکیہ تک محدود کر لینا کبھی بھی بحیثیت مجموعی معاشرے میں مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ذات کا تزکیہ ثمر آور نہیں' البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرے میں مطلوبہ نتائج کے حصول کے حوالے سے نامکمل اور ادھورا ہے۔ لہٰذا فرد' گروہ یا ریاست اگر ظلم کدہ بن چکی ہے تو اُس عادلانہ نظام کے قیام کے لیے لسانی' قلمی اور آخر کار عملی طور پر میدان میں نکل کر اگر کوئی بندۂ خدا یا بندگانِ خدا پر مشتمل ایک جماعت خالصتاً قرآن وحدیث کی تعلیمات کو بنیاد بنا کر اللہ کے دین کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے جان و مال کی قربانی دیتی ہے تو یہ اجتماعی تزکیہ کی بہترین مثال ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت اور اُن سے منسلک افراد ذاتی سطح پر شرعی تقاضوں کی ادائیگی کا عملی نمونہ نظر آنے چاہئیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ازحد ضروری ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے' جس کے اثرات ذاتی تزکیہ کے حصول میں بھی سامنے آ سکتے ہیں اور اجتماعی جدوجہد میں بھی ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ انہیں سمجھنا' ان سے بچنا اور لوٹ کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جانا نفس کے تزکیہ کا حصہ ہے۔ خود معاشرہ اور ریاست کو عدلِ اجتماعی پر قائم دائم رکھنے کے لیے ہر آن جدوجہد کرتے رہنا ہی تزکیہ کی بنیاد ہے۔

آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ ذاتی اور اجتماعی تزکیہ ایک کُل کے دو جزو ہیں۔ یہ ایک پیکج ہے' ایک یونٹ ہے جنہیں اگر جدا کر دیا جائے تو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ پھر انسانیت کسی صورت فلاح نہیں پا سکے گی۔ یہاں اُس حدیث قدسی کا حوالہ یقیناً برمحل ہوگا جس کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ طویل مدت تک رات کا راہب بنا رہا' یعنی عبادت میں مشغول رہا لیکن اُس کی بستی کے لوگ بدترین گناہوں میں ملوث تھے۔ وہ اُن کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کو تیار نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُس بستی کو تباہ کرنے کا حکم دیا۔ جب فرشتہ نے اللہ رب العزت سے اُس عابد شخص کا ذکر کیا کہ وہ بھی اس بستی کا باشندہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ الٹا دو اِس بستی کو پہلے اُس پر'

(باقی صفحہ 95 پر)

پاکستان میں اسلامی انقلاب

کیا — کیوں — کیسے؟

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

''اسلامی انقلاب'' کی اصطلاح اب کثرت سے استعمال ہونے لگی ہے' لیکن اکثر لوگ کنفیوژن کا شکار ہیں کہ اسلامی انقلاب کا اصل مفہوم کیا ہے! یہ انقلاب زندگی کے کن گوشوں کو محیط ہوگا اور انقلاب لانے کا نبوی طریق کون سا تھا؟ ۱۹۷۹ء میں انقلابِ ایران کے بعد یہ اصطلاح زیادہ اُجاگر ہو کر سامنے آئی تھی۔ اسی دور میں بانی تنظیم اسلامی نے نبی اکرم ﷺ کے برپا کردہ عظیم انقلاب کے مراحل اور اس کے منہاج و طریق کار کی مفصل وضاحت مسجد دارالسلام لاہور میں مسلسل دس خطابات جمعہ میں فرمائی تھی۔ یہ خطابات بعد میں ''منہجِ انقلاب نبوی ﷺ'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔

اسلامی انقلاب سے کیا مراد ہے؟ پاکستان میں اسلامی انقلاب لانا کیوں ضروری ہے؟ اس انقلاب کو برپا کرنے کا درست منہاج اور طریق کار کون سا ہے؟ ان اہم سوالات کا نہایت واضح اور جامع جواب بانی محترم نے ۳۰ / اگست ۱۹۸۵ء کو لاہور میں اپنے ایک خطاب عام میں دیا تھا۔ ذیل میں اسی خطاب کو ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے کہ اس موضوع پر یہ حد درجہ جامع بھی ہے اور مؤثر بھی!

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیاتِ قرآنی' احادیثِ نبویؐ اور ادعیہ ماثورہ کے بعد:

ہماری آج کی گفتگو تین حصوں پر مشتمل ہوگی: اسلامی انقلاب کا مفہوم کیا ہے؟ پاکستان میں اسلامی انقلاب آنا کیوں ضروری ہے؟ یہ انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟ ان تین سوالات میں سے ہر ایک کے ضمن میں مجھے دو دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ گویا آج ہماری گفتگو کُل چھ باتوں پر مشتمل ہوگی۔

’’اسلامی انقلاب‘‘: کیا؟

(i) اسلامی انقلاب کا مفہوم اور اس کے مترادفات

’’اسلامی انقلاب‘‘ ایک جدید اصطلاح ہے‘ جو قرآن و حدیث میں کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ اس اعتبار سے اس پر یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ قرآن و حدیث کی اصطلاحات کو چھوڑ کر یہ اصطلاح کیوں استعمال کی جاتی ہے۔ مَیں اصولاً اسی بات کا شدت سے قائل ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو ہمیں قرآن و حدیث ہی کی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں اور ان کے ہوتے ہوئے جدید اصطلاحات سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہر نئی اصطلاح میں کوئی نہ کوئی نیا مفہوم لازمی طور پر شامل ہوتا ہے اور لاکھ کوشش کے باوجود اس کے استعمال سے غیر شعوری طور پر یہ امکان موجود رہتا ہے کہ اس کے اندر مضمر غلط مفہوم بھی ذہن میں بیٹھ جائے۔

اس کے باوجود مَیں ’’اسلامی انقلاب‘‘ کی اصطلاح اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ بسا اوقات Generation Gap کی وجہ سے ایک نسل کی بات اگلی نسل سمجھنے سے عاری ہوتی ہے۔ نوجوان نسل اپنی اصطلاحات میں بات کرتی اور سمجھتی ہے؛ وہ قدیم اصطلاحات سے ناواقف ہوتی ہے۔ چنانچہ اصطلاحات کے فرق کی وجہ سے ابلاغ نہیں ہو پاتا اور بات ذہنوں تک نہیں پہنچتی۔ ہمارے ہاں جو جنریشن گیپ موجود ہے یہ ایک دو نسلوں کا معاملہ نہیں ہے‘ بلکہ بیسیوں نسلوں پر محیط ہے۔ ہماری کم از کم آٹھ نسلیں تو انگریز کی غلامی میں گزری ہیں‘ چنانچہ ہم نے انگریزی تہذیب و تمدن کو اپناتے ہوئے انگریزی اصطلاحات میں سوچنے کی عادت ڈال لی ہے۔ اسی کا مظہر ہے کہ آج ہماری عظیم اکثریت قمری مہینوں کی تاریخوں تک سے واقف نہیں ہوتی اور انہیں صرف عید‘ بقرعید کے دنوں یا ماہ رمضان کے دوران قمری تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا سال کا تصور اسلامی نہیں‘ بلکہ انگریزی سال کا ہے جو ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ اب یہ فرق بالفعل واقع ہو چکا ہے‘ جس کے باعث بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خالص دینی اصطلاح استعمال کی جائے اور صرف قرآن و سنّت کے حوالے سے بات کی جائے تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یوں بات کرنے کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ لوگوں کے ذہن تک بات پہنچانے کی غرض سے بعض جدید اصطلاحات کا استعمال ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے۔

آج کی دنیا میں جس چیز کو ’’انقلاب‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے ساتھ ہم نے ’’اسلامی‘‘ کا سابقہ لگا کر ’’اسلامی انقلاب‘‘ کی مرکب اصطلاح بنالی ہے اس کے لیے قرآن مجید اور حدیثِ نبویؐ میں پانچ اصطلاحات وارد ہوئی ہیں۔ ہم اپنے دروس اور تنظیمی اجتماعات میں یہی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں‘ لیکن پبلک مقامات پر عوام کو سمجھانے کے لیے ’’اسلامی انقلاب‘‘ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ قرآن و حدیث میں وارد شدہ پانچ اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) تکبیرِ ربّ: سورۃ المدثر میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾

’’اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اُٹھو اور خبردار کرو‘ اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو!‘‘

یہ آیات بالکل ابتدا میں نازل ہونے والی آیاتِ قرآنی میں سے ہیں۔ گویا ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کا حکم اُن ابتدائی احکام میں سے ہے جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دیے گئے۔

معمولی سا دینی مزاج رکھنے والے مسلمان کو بھی معلوم ہوگا کہ ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کے معنی کیا ہیں۔ ’’تکبیر‘‘ کا لفظی معنی ’’بڑا کرنا‘‘ ہے‘ جیسے ’’تصغیر‘‘ کا معنی ’’چھوٹا کرنا‘‘ اور ’’تسہیل‘‘ کا معنی ’’آسان کرنا‘‘ ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ربّ کو بڑا کرنے کا مفہوم کیا ہوا جبکہ ربّ تو بذاتِ خود بڑا ہے؟ اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ ربّ بذاتہٖ سب سے بڑا ہے لیکن دنیا میں اس کی بڑائی مانی نہیں جارہی‘ اس کا قانون نافذ نہیں کیا جارہا‘ بلکہ یہاں انسانوں کے خودساختہ قوانین نافذ ہیں۔ اس طرح بالفعل بڑے تو وہ بنے ہوئے ہیں جنہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جو حکم چاہیں نافذ کردیں اور جس قرآنی حکم پر چاہیں عمل درآمد روک دیں۔ مثال کے طور پر جنرل ضیاء الحق صاحب نے ایک آرڈی نینس جاری کیا تھا کہ عورتوں کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ایک غیر شادی شدہ عورت زنا کا ارتکاب کرتی ہے تو اسے کوڑے کیوں نہیں لگائے جائیں گے‘ جبکہ نصِ قرآنی موجود ہے: ﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ﴾ (النور:۲) یعنی ’’زنا کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت‘ دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔‘‘ اس آرڈی نینس کے ذریعے گویا ایک آیتِ قرآنی کی تنسیخ کردی گئی۔ اس کا

یہی معنی ہوا کہ اللہ کا حکم نیچے اور جنرل ضیاء الحق کا اختیار بالاتر ہو گیا۔ اگر کہیں بادشاہت قائم ہے تو بادشاہ کا حکم اوپر ہے‘ اللہ کا نہیں۔ اسی طرح جمہوریت میں حاکمیت جمہور کی ہے‘ حکم کا اختیار ان کا ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں یہ بات صرف اقرار کی حد تک صحیح ہے کہ ’’اللہ سب سے بڑا ہے۔‘‘ اللہ آسمانوں میں تو بڑا ہے‘ زمین میں ہم نے اس کو بڑا نہیں مانا بلکہ اپنے بنائے ہوئے نظام نافذ کر کے خود بڑے بن بیٹھے ہیں اور اپنے طرزِ عمل سے اسے چھوٹا بنا رہے ہیں۔ ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کا مفہوم یہ ہو گا کہ دنیا میں ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں واقعتاً اللہ بڑا ہو۔ یعنی اُس کی بڑائی بالفعل مانی جا رہی ہو‘ اُس کی حاکمیتِ اعلیٰ کو تسلیم کیا جا رہا ہو‘ اُس کے حکم سے اوپر کسی کا حکم نہ ہو اور اُس کی بات سے بالاتر کسی کی بات نہ ہو۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ پہلے سے موجود نظام کو بدلنا ہو گا۔ نظام کی اس تبدیلی کا نام ’’انقلاب‘‘ ہے۔ گویا ’’اسلامی انقلاب‘‘ کا مفہوم بھی وہی ہے جو ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کا ہے۔

ب) **اقامتِ دین**: اس حقیقت سے ہر مسلمان آگاہ ہے کہ ہمارا دین صرف نماز‘ روزے تک محدود نہیں بلکہ یہ پوری زندگی سے متعلق احکام اور ہدایات پر مشتمل ہے۔ اس میں حلال و حرام کی وضاحت بھی ہے‘ اوامر و نواہی ہیں‘ فوج داری اور دیوانی قوانین بھی ہیں‘ غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس سے متعلق حکم موجود نہ ہو۔ اسی بنیاد پر مدینہ منورہ میں یہودیوں نے مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا کہ تمہارے نبیؐ تمہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ بات حضور ﷺ سے عرض کی تو آپؐ نے فرمایا کہ تم انہیں جواب دو کہ ہاں‘ ہمارے نبیؐ نے تو ہمیں استنجا کرنا بھی سکھایا ہے‘ اس لیے کہ طہارت بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہمارا دین پوری زندگی کا دین ہے‘ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس دین کے بارے میں سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ حکم دیا گیا: ﴿.....اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ .....﴾ (آیت ۱۳) ’’کہ دین کو قائم کرو!‘‘ دین کو قائم کرنے کا مطلب پورے نظام دین کو قائم کرنا ہو گا نہ کہ صرف نماز قائم کرنا‘ روزہ رکھنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔ یہ تو ارکان ہیں جو دین کو قائم کرنے کے ذرائع ہیں۔ نماز قائم کرنا دین کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ روزہ رکھنے سے ہمیں دین کو قائم کرنے کے لیے تقویٰ کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے مال کی محبت دل سے نکالنے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ ’’اقامتِ دین‘‘ کا

مفہوم پورے کے پورے نظام دین کو قائم کرنا ہے‘ اور یہی مفہوم ’’اسلامی انقلاب‘‘ کا ہے۔

’’اَقِیْمُوا الدِّیْنَ‘‘ کا ترجمہ ہم نے ’’دین کو قائم کرو‘‘ کیا ہے۔ بعض مترجم حضرات نے اس کا ترجمہ ’’دین کو قائم رکھو‘‘ بھی کیا ہے۔ یہ محض لفظی فرق ہے‘ مفہوم کے اعتبار سے دونوں تراجم میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں کسی جگہ ایک خیمہ لگانا ہے تو کہیں گے ’’خیمے کو کھڑا کرو‘‘ اور خیمہ اگر قائم ہے اور تیز آندھی چل رہی ہے تو اب کہا جائے گا کہ ’’خیمے کو کھڑا رکھو‘‘ یعنی کوشش کرو کہ یہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ چنانچہ اس کا تقاضا ہو گا کہ خیمے کی رسیوں کو مضبوطی سے تھاما جائے‘ اس کے جو کھونٹے گڑے ہوئے ہیں ان کو مضبوط کیا جائے اور اس کے بانسوں کو گرنے نہ دیا جائے۔ یہی مفہوم ’’اقامتِ دین‘‘ کا ہے کہ اسلام اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کیا جائے اور اگر قائم ہے تو اسے قائم رکھا جائے۔ جیسے محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب میں دین قائم کر دیا اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اسے قائم رکھا۔ بعد کے ادوار میں دین کی عمارت درجہ بدرجہ منہدم ہونے لگی‘ یہاں تک کہ یہ بالکل زمین بوس ہو گئی۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ دین کی اس عمارت کو از سرِ نو قائم کریں۔ یہی ’’اقامتِ دین‘‘ کا مفہوم ہے اور یہی ’’اسلامی انقلاب‘‘ کا۔

ج) **غلبۂ دین (اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ)**: یہ اصطلاح قرآن حکیم میں تین مقامات پر آئی ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ میں بعینہٖ ایک جیسے الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ .....﴾

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ اسے غالب کر دے کُل کے کُل دین پر۔‘‘

ہمارا دین‘ دینِ حق ہے جو مغلوب ہونے کے لیے نہیں بلکہ غالب رہنے کے لیے آیا ہے۔ اَلْحَقُّ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ ’حق کا یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو‘ نہ یہ کہ مغلوب رہے۔

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی میں محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی غلبۂ دین قرار دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین کو غالب کر دیا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

کے دور میں غلبۂ دین کا یہ عمل توسیع پذیر رہا‘ لیکن بعد کے ادوار میں یہ عمل رجعتِ قہقری کا شکار ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا یہ تقاضا ہے کہ اُمتِ مُسلمہ دُنیا میں کُل کے کُل دین کو غالب کرنے کی جِدّوجُہد کرے۔ دین اگر مغلوب اور پامال ہے تو اس کو غالب کرنے کی جِدّوجُہد ہمارا دینی فریضہ ہے۔ یہی مفہوم ’’اسلامی انقلاب‘‘ کی اصطلاح کا ہے۔

۵) دینِ کُل کا کُل اللہ کا ہو جائے (یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ): یہ اصطلاح قرآن حکیم میں سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹)

’’اور ان (کافروں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔‘‘

یہ آیتِ مبارکہ غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ مکّی زندگی کے بارہ برس کے دوران اور اس کے بعد مدینہ میں بھی دو سال تک مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ پھر جب حکم آ گیا کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ (البقرۃ:۲۱۶) یعنی ’’تم پر (اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے) جنگ فرض کر دی گئی ہے‘‘ تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا کہ مسلمانو! اب تمہاری تلواریں اُس وقت تک میان میں واپس نہ جائیں جب تک کہ فتنہ و فساد بالکل ختم نہ ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔ یہ نہیں کہ مسجد میں تو اللہ کا دین ہو اور پارلیمنٹ میں اللہ کا دین نہ ہو۔ مولانا گوہر رحمٰن نے پارلیمنٹ میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی تھی تو وہاں پر ان کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ ہماری پارلیمنٹ میں دین کی باتوں کا مذاق اس لیے اڑایا جاتا ہے کہ وہاں اللہ کو بڑا نہیں مانا جاتا۔ میں یہ بات بار بار عرض کروں گا کہ ہمارا دین زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ چنانچہ دین کا ایک حصہ بھی علیحدہ کر دیا جائے گا تو باقی جزوِ دین رہ جائے گا‘ کُل دین نہیں رہے گا۔

۶) اللہ کے کلمہ کی سربلندی (لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا): یہ اصطلاح حدیثِ نبویؐ میں آئی ہے۔ جب جہاد و قتال کا مرحلہ شروع ہو گیا تو نبی اکرم ﷺ سے استفسار کیا گیا کہ کوئی شخص اپنی بہادری کے اظہار کے لیے شریکِ جنگ ہوتا ہے‘ کوئی شخص مالِ غنیمت کے حصول کے لیے لڑتا ہے اور کوئی شخص کسی قبائلی عصبیت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے (یعنی جس قبیلے کے خلاف

مسلمان لشکر کشی کر رہے ہیں اس قبیلے کے ساتھ کسی مسلمان کا ذاتی جھگڑا بھی ہے اور اب وہ شخص ذاتی انتقام کے جذبے سے اس لشکر میں شریک ہوا ہے)‘ تو ان میں مجاہد فی سبیل اللہ کون ہے! رسول اللہ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (متفق علیہ)

’’(ان میں سے کوئی بھی مجاہد فی سبیل اللہ نہیں ہے) مجاہد فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو محض اس لیے جنگ کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو جائے۔‘‘

قرآن و حدیث کی ان پانچ اصطلاحات کا مفہوم آج کے نوجوانوں کو سمجھانے کے لیے ’’اسلامی انقلاب‘‘ کی اصطلاح استعمال کرنا پڑتی ہے۔

(ii) اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے؟

اسلامی انقلاب کے حوالے سے لوگ بڑے مغالطوں کا شکار ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کچھ اسلامی سزائیں نافذ ہو جائیں‘ مثلاً چوروں کے ہاتھ کٹنے لگیں اور بدکاروں کو کوڑے لگنے لگیں‘ تو بس اسلامی انقلاب آ گیا۔ ہمارے ہاں حکومتی سطح پر بھی اس حوالے سے بڑے دھوکے دیے گئے ہیں کہ بینکوں میں رکھی گئی رقوم سے زکوٰۃ کی کٹوتی کر کے اور سود کو ’’مارک اَپ‘‘ کا نام دے کر اسلامی نظام نافذ کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ واضح طور پر جان لیجیے کہ اسلامی انقلاب کا مطلب اُس نظامِ عدل کو قائم کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجا۔

یہ عدل سیاسی میدان میں بھی ہوگا‘ یعنی زمین پر کوئی حاکم نہیں‘ کوئی محکوم نہیں‘ سب اللہ کے بندے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے حقوق کے اوپر کوئی ڈاکا نہیں ڈالا جا سکتا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایران کے گورنر تھے اور وہ گورنری بھی ریوڑیوں کی طرح بٹی ہوئی نہیں تھی‘ بلکہ وہ گورنر اس لیے تھے کہ خود فاتحِ ایران تھے۔ انہوں نے صرف یہ کیا تھا کہ اپنے مکان کے باہر ایک ڈیوڑھی بنا کر وہاں ایک دربان کھڑا کر دیا تھا‘ لیکن اس پر دارالخلافہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ڈانٹ کا خط آ گیا تھا کہ: ’’اے سعد! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا‘ تم نے انہیں کب سے غلام بنا لیا ہے؟‘‘ یہ آزادی تھی جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی تھی۔ یہ حقوق تھے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے۔ اگر نظام ایسا قائم ہے کہ

لوگوں کے حقوق پر کچھ لوگوں نے ڈاکے ڈالے ہوئے ہیں‘ کچھ لوگ ان کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں‘ تو جب تک اس نظام کو ختم نہیں کیا جائے گا اسلام نہیں آ سکتا۔ اسلام صرف نماز‘ روزہ کا نام نہیں ہے۔

سیاسی عدل کی طرح اسلام معاشی عدل کا بھی ضامن ہے۔ ہمارے ہاں جو جاگیرداری نظام قائم ہے یہ انگریز سے وفاداری کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے انگریز کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کیا تو انہیں جاگیریں ملیں۔ اب ان جاگیرداروں کے بیٹے مُنہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور ان کی اعلیٰ ترین سطح کی تعلیم یورپ یا امریکہ میں ہوتی ہے‘ وہ یہاں نہیں پڑھتے۔ یہ ایک مخصوص طبقہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور عام لوگوں پر مسلط ہیں۔ سیاست میں وہی ہیں‘ CSP وہی ہیں‘ صنعت کار بھی وہی ہیں۔ لہٰذا جب تک اس ملک سے جاگیرداری کا جنازہ نہیں نکلے گا‘ یہاں حقیقی اسلام کے قیام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کی معاشی ناہمواریوں کے ہوتے ہوئے عدل اور انصاف کہاں سے آئے گا؟ کہنے کو تو سب کے لیے مواقع برابر ہیں‘ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ ایک کے بچے کو عام پرائمری سکول میں داخلہ نہیں ملتا جبکہ ایک کا بچہ چاہے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا ہو وہ اسے امریکہ بھیج رہا ہوتا ہے۔ یہ پیسہ کہاں سے آ گیا ہے؟ کیا یہ حلال کا پیسہ ہے؟ یہ جو بلند و بالا عمارات بنتی ہیں‘ بیس بیس کنال کی کوٹھیاں تعمیر ہوتی ہیں‘ کیا یہ حلال کے پیسے سے بنتی ہیں؟ ان کو تحفظ دینے والا نظام اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ قطعاً نہیں کہتے کہ آپ کمیونزم والا معاشی نظام لائیں۔ اسلام نے بھی آپ کو اس معاشی ناہمواری کا حل بتایا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مزارعت حرام ہے۔ جس شخص کی زمین ہے وہ اسے خود کاشت کرے‘ یا پھر اپنے بھائی کو دے دے‘ کہ وہ کاشت کر لے‘ لیکن خود اس کی محنت میں سے کچھ حصہ وصول نہ کرے‘ یہ حرام ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے جو احادیث نبویہؐ پر مبنی ہے۔ البتہ فقہ حنفی میں فتویٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے رائے پر نہیں ہے‘ بلکہ صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہما کی رائے پر ہے‘ جو امام صاحب کے شاگرد ہیں۔ ان دونوں حضرات نے مزارعت کو دو شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ پھر فقہ حنفی کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتح کیا ہو اس کی زمینیں ذاتی ملکیت رہتی ہی نہیں بلکہ وہ سب اُمّت کی اجتماعی ملکیت قرار پاتی ہیں۔ وہاں کوئی

زمین دار نہیں ہوتا‘ سب کے سب کاشت کار ہوتے ہیں۔ وہ موروثی کاشت کار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی رُو سے پاکستان کی زمینیں عشری نہیں ہیں‘ خراجی ہیں‘ لہٰذا خراج براہِ راست بیت المال میں جانا چاہیے۔ یہ بیچ میں زمین دار کہاں سے ٹپک پڑا؟ یہ موجودہ دور کے مسائل ہیں جن کا حل اسلام پیش کرتا ہے۔ آپ صرف نماز‘ روزے کی تلقین کریں گے تو زمانہ آپ کو بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔ لوگ تو ان مسائل کا حل چاہتے ہیں جو انہیں درپیش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص نے ڈگڈگی بجائی کہ ”روٹی‘ کپڑا‘ مکان“ اور آپ کو یاد ہے کہ کیا ہوا تھا؟ وہی جو علامہ اقبال نے ابلیس کے الفاظ نقل کیے ہیں: ؎

کیا امامانِ سیاست‘ کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو!

لہٰذا جان لیجیے کہ اسلام لوگوں کو جو حقوق دیتا ہے آپ اگر وہ حقوق نہیں دیں گے تو لوگ اسے بھی مسترد کر کے کسی دوسرے نظام کی طرف رجوع کریں گے۔ لہٰذا اسلامی نظام کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو نافذ کیا جائے۔

تیسری چیز سماجی مساوات ہے۔ اسلام میں کوئی اونچا نہیں‘ کوئی نیچا نہیں‘ کوئی اعلیٰ نہیں‘ کوئی گھٹیا نہیں۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ ہمارے ہاں سید کی برتری کا تصور ہندوستان میں برہمنوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دوٹوک الفاظ میں فرما دیا تھا:

((أَلَا، لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ، وَ لَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَ لَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ، وَ لَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (رواہ احمد)

”کسی عربی کو کسی عجمی پر‘ کسی عجمی کو کسی عربی پر‘ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے‘ سوائے تقویٰ کے۔“

ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((كُلُّكُمْ بَنُوْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ))

”تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔“

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ”سیدنا بلال“ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ وہ نظام ہے جو آج کے دور کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں کوئی غیر مسلم جب مسلمان

ہوتا ہے تو وہ ''مصلی'' ہی رہتا ہے' چودھری کے برابر چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ کہاں کا نظام ہے؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

سید زادہ (پتہ نہیں وہ سیّد ہے بھی یا نہیں' خود ساختہ سیّد بھی بہت ہوتے ہیں) خواہ زانی ہو یا شرابی' اس کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا جائے گا اور کوئی شخص بڑے سے بڑا متقی ہو اس کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سماجی سطح پر تمام انسان برابر ہیں۔ یہ سب ایک نسل انسانی سے ہیں' لہٰذا کوئی اونچا نہیں' کوئی نیچا نہیں۔ ہمارے ہاں سماجی عدم مساوات کا نقشہ دیکھنا ہو تو دیہات میں دیکھیے۔ ملتان سے آگے چلیں تو دریائے سندھ کے دونوں طرف جتنی زرخیز زمینیں ہیں وہ ساری اکثر و بیشتر ان لوگوں کی ملکیت ہیں جو پیر بنے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی سید ہے' کوئی جیلانی ہے' کوئی فلانی ہے اور عوام ان کی ''رعیت'' ہیں۔ یہ نظام قائم رکھ کر آپ سمجھتے ہیں کہ اسلام آجائے گا؟ ایں خیال است و محال است و جنوں!

یہ جان لیجیے کہ جب میں ''اسلامی انقلاب'' کا نام لیتا ہوں تو اس سے مراد اسلام کا عادلانہ نظام ہے۔ یعنی اسلام کی سماجی مساوات' اسلام کا معاشی عدل اور اسلام کے عطا کردہ سیاسی حقوق' ان سب کو قائم کرنا اسلامی انقلاب ہوگا۔ سورۃ الشوریٰ میں ﴿اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ﴾ والی آیت کے بعد اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ اے نبیؐ ان سے کہہ دیجیے: ﴿وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ﴾ (آیت ۱۵) یعنی ''(مجھے واعظ نہ سمجھنا) مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔'' سورۃ الحدید میں فرمایا گیا کہ ''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں اور ہدایات دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری ﴿لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ﴾ تاکہ لوگ عدل و انصاف پر کاربند ہوں۔'' جن لوگوں نے دوسروں کے حقوق غصب کیے ہوں کیا وہ آسانی سے لوٹا دیں گے؟ شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا آسان کام تو نہیں ہے۔ جو جاگیردار بنے بیٹھے ہیں وہ اپنی جاگیریں آسانی سے تو نہیں چھوڑ دیں گے' وہ اس نظامِ عدل کے راستے میں مزاحم ہوں گے۔ فرمایا گیا کہ ایسے عناصر کی سرکوبی کے لیے ہم نے لوہا اتارا ہے جس سے تلواریں بنتی ہیں' اِن سے اُن لوگوں کی سرکوبی کرو جو اللہ کے دین' اِس نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے۔ فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ یَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اللہ یہ معلوم کرے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا' بہت زبردست ہے۔'' یہاں تک ''اسلامی انقلاب: کیا؟'' کا جواب ہم نے دو اعتبار سے دیکھ لیا۔ اب ہم اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے ''اسلامی انقلاب: کیوں؟'' کے جواب پر غور کریں گے۔

''اسلامی انقلاب'': کیوں؟

i) مسلمانوں کا دینی فریضہ

''پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیوں؟'' کا اہم تر جواب یہ ہے کہ یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا تقاضا ہے۔ ایک شخص اللہ کی وفاداری کا دعویٰ کرتا ہو' جبکہ اللہ کا دین مغلوب ہو اور یہ آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہو اور یہ بھی کہتا ہو کہ مجھے اللہ سے محبت ہے' اس سے بڑا جھوٹا اور کون ہوگا؟ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ سے بڑا عشق ہے' جبکہ اس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے احکام کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہوں اور اس بدبخت کے احساسات پر جوں تک نہ رینگے تو اس کا عشقِ رسول ﷺ کا دعویٰ باطل ہے۔ کمزور سے کمزور انسان بھی اپنی ماں کی توہین برداشت نہیں کر سکتا' وہ اگر کچھ نہ کر سکے تو بھی اس کے سارے جسم کا خون اس کے چہرے پر سمٹ آئے گا اور ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے گا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ماں کی گالی کھا کر انسان اطمینان سے بیٹھا رہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ حد درجہ بے غیرت و بے حمیت ہے۔ اسی طرح سوچیے کہ اس دین کی بھی کوئی غیرت و حمیت ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ بھی کوئی وفاداری درکار ہے یا نہیں؟ ہمارے بڑے دعوے ہیں کہ ہم اسلام کے ماننے والے ہیں' اسلام کے شیدائی ہیں' لیکن ہمارا حال کیا ہے؟ جان لیجیے کہ جو شخص اسلام کو قائم کرنے کی جدّ و جُہد نہیں کرتا اس کی اسلام کے ساتھ کوئی وفاداری نہیں ہے۔

اس ضمن میں ایک لرزہ دینے والی حدیث ملاحظہ کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اِلٰی جِبْرِیلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ: أَنِ اقْلِبْ مَدِینَۃَ کَذَا وَکَذَا بِأَھْلِھَا)) ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت الٹ دو۔'' ((قَالَ: فَقَالَ: یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ)) حضور ﷺ نے فرمایا: اس پر حضرت جبریل نے عرض کیا: ''پروردگار! (فلاں بستی کو الٹ دوں؟) اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آج تک پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔'' اس سے آپ اس شخص کی نیکی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس نے آنکھ جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہ کی ہو اس کا تقویٰ' اس کی نیکی' اس کی عبادت گزاری' اس کا ذاتی اعتبار سے اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونا کس انتہا کا ہوگا۔ اس لیے کہ گواہی دینے والا نہ کرائے کا گواہ ہے' نہ جھوٹا وکیل ہے' بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ جہاں گواہی دے رہے ہیں وہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکے گا' وہاں مبالغے کا کوئی امکان نہیں کہ اتنا نیک شخص! لیکن ((قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ)) حضور ﷺ فرماتے ہیں: اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کو دوبارہ حکم دیا ''الٹو اس بستی کو پہلے اس بدبخت پر پھر دوسروں پر۔'' ((فَاِنَّ وَجْھَہُ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ)) ''اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری حمیت کی وجہ سے کبھی سرخ نہیں ہوا۔'' اتنا بے غیرت انسان کہ میرے احکام ٹوٹتے رہے' میری شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں' میرے اوامر کا مذاق اڑتا رہا' نواہی کا چرچا ہوتا رہا اور یہ گوشہ نشین ہو کر اللہ اللہ کرنے میں لگا رہا۔ معلوم ہوا کہ یہ دوہرا مجرم ہے اور عذاب کا اوّلین مستحق ہے۔ چنانچہ ''اسلامی انقلاب: کیوں؟'' کا سب سے پہلا جواب یہی ہے کہ یہ ہمارا دینی فرض ہے' اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ دین قائم کر دینا فرض ہے' بلکہ اسے قائم کرنے کی کوشش کرنا فرض ہے۔ اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدّوجُہد فرض ہے۔ یہ ہوگا تبھی جب اللہ چاہے گا۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلام کے غلبے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ مثلاً حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غلبہ اسلام کی جدّوجُہد کے دوران شہید ہو گئے لیکن وہ اس دنیا سے (معاذ اللہ) محروم و ناکام تو نہیں گئے۔ پھر ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہیں جو مکہ ہی میں شہید کر دیے گئے تھے لیکن ان کی جدّوجُہد اسی رخ پر تھی۔ چنانچہ دین کو قائم کرنے کی جدّوجُہد یا اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کی کوشش اس لیے ضروری ہے کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔

ii) پاکستان کی بقا و استحکام کا تقاضا

''اسلامی انقلاب: کیوں؟'' کے ضمن میں پہلے میں نے دین کی بات کی' اب دنیا کی بات بھی سن لیجیے۔ ہماری دنیا کیا ہے؟ یہ ملک پاکستان اللہ کا عطا کردہ ملک' جس میں ہمیں آزادی کی دولت حاصل ہے۔ اگرچہ یہاں عوام کو ان کے حقوق میسر نہیں ہیں اور ملکی وسائل پر چند مخصوص طبقات قابض ہیں' لیکن بہرحال اس معنی میں تو آزادی ہے کہ انگریز یا ہندو ہم پر حکمران نہیں۔ ہمارا یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور اسلام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی شخص خالص مادی اعتبار سے بھی سوچے اور دین کا فرض اس کے سامنے نہ ہو' تو بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کی بقا و استحکام کا ضامن اسلام ہے۔ میرے نزدیک تو اوّلین فرض دین کا ہے' دنیا بعد میں ہے' مسلمان تو وہی ہے جس کے لیے پہلے دین ہو پھر دنیا۔ اگر کوئی صرف دنیا کی بات کرتا ہے تو اس کو بھی میں ثابت کر کے یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر یہاں اسلامی انقلاب نہ آیا تو اس ملک کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ جو ہمیں قائداعظم کے اقوال سنائے جاتے ہیں کہ ''پاکستان دنیا میں ہمیشہ قائم رہنے کے لیے آیا ہے'' کیا ان کی تکرار سے پاکستان مستحکم ہو جائے گا؟ قائداعظم ہمارے محسن تھے' بہت بڑے لیڈر تھے' لیکن نبی اور رسول تو نہیں تھے کہ جن کے منہ سے نکلی ہوئی بات وحی الٰہی پر مبنی ہو۔ پھر یہ حقیقت ہے کہ قائداعظم کا قائم کیا ہوا پاکستان تو آج روئے ارضی پر موجود ہی نہیں رہا۔ چنانچہ یہ جملہ ویسے ہی غلط ہو چکا ہے۔ جو بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر پاکستان ایک آزاد' خودمختار اور باوقار ملک کی حیثیت سے باقی رہ سکتا ہے تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے۔ اس کا استحکام تو بڑی دُور کی بات ہے' میرے نزدیک اسلامی انقلاب کے بغیر اس ملک کے باقی رہنے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے جو بات کہی تھی وہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے کہی تھی' لیکن وہ کسی اور ملک کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو' پاکستان کے لیے سو فیصد درست ہے کہ:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

یہ پاکستان بڑا خاص ملک ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک مصنوعی ملک ہے۔ ہندوستان سے پاکستان کو ایسے کاٹا گیا جیسے کیک کاٹا جاتا ہے۔ چنانچہ اس تقسیم میں میدانوں اور دریاؤں تک کو

کاٹا گیا ہے اور بھارت کے ساتھ ہماری کوئی فطری سرحد موجود نہیں ہے۔ بھارت وہ ملک ہے جس نے ایک دن کے لیے بھی ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ ۱۹۷۱ء میں اسے ایک موقع مل گیا تھا تو اس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اب تک اس ملک کی حفاظت فرمائی ہے۔ اس دوران کئی مواقع پر یہ ملک عدم استحکام کا شکار ہوا' کئی بار علیحدگی کی تحریکوں نے زور پکڑا' جیسے سندھ کی تحریک کے دوران ریلوے لائن کے سلیپر جلانے کی کوشش کی گئی۔ اس موقع پر علیحدگی پسندوں کو بھارت سے مدد نہ مل سکی' ورنہ اگر ان کے پاس کہیں ڈائنامائٹ وغیرہ ہوتے تو ہماری لائف لائن کئی جگہ سے ٹوٹ سکتی تھی۔ ایک دفعہ یہ لائف لائن ٹوٹ جائے تو فوجی گاڑیوں اور ٹینکوں کے لیے تیل کہاں سے آئے گا؟ اگر آپ کی ''آئل سپیشل'' ٹرین چند دن کراچی سے نہ آئے تو پورے ملک میں پہیہ جام ہو جائے گا یا نہیں؟ اس سے جو حشر بپا ہو گا اس کا اندازہ کیجیے۔ الحمدللہ کہ اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے ابھی تک بچایا ہوا ہے۔

''اسلامی انقلاب: کیوں؟'' کے دو جواب ہو گئے۔ ایک یہ کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے' یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ ہماری وفاداری کا تقاضا ہے:ؔ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

دوسرے یہ کہ اسی میں پاکستان کی بقا ہے۔ اسی سے پاکستان کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

بقیہ: تزکیۂ نفس

پھر دوسرے لوگوں پر کہ میری معصیت میں مبتلا معاشرے کو دیکھ کر اس شخص کے چہرے کا رنگ بھی نہیں بدلا (واضح رہے یہ حدیث کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم ہے)۔ علاوہ ازیں ایک بڑا اہم اور غور طلب حقیقت یہ ہے کہ اصحابِ صُفّہ جو شب و روز عبادت کرتے تھے اور حضور ﷺ کے دربار میں حاضر رہتے تھے' اُن میں سے کوئی بھی عشرۂ مبشرہ میں شامل نہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا اُنہیں نصیب ہوتی ہے جو رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہوتے ہیں۔ شب گزاری اور اللہ کے دین کے نفاذ کے لیے جان و مال کی قربانی نفس کے تزکیہ کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ ❁

رشتہ داروں کے حقوق

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کے اردگرد بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن میں کچھ اس کے دوست احباب اور شناسا ہوتے ہیں جبکہ کچھ رشتہ دار بھی ہوتے ہیں۔ رشتہ داروں کی اہمیت بہت زیادہ ہے' کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تعلق دار بنایا ہوتا ہے۔ رشتہ داروں میں ماں باپ کے تعلق دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سسرالی افراد بیوی کی طرف سے تعلق دار ہوتے ہیں۔

رشتہ داری ایک خصوصی تعلق کا نام ہے۔ جب کسی شخص کے ہاں خوشی کا موقع آتا ہے تو اس کے رشتہ دار اس کی خوشی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ کوئی رنج' مصیبت پائے یا صدمے سے دوچار ہو تو رشتہ دار اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کر کے اس کے غم کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی تاکید کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کا رزق کشادہ ہو اور اس کی عمر لمبی ہو اسے صلہ رحمی کرنا چاہیے۔'' (بخاری عن انس بن مالکؓ)

جب رشتہ داروں کے باہمی تعلقات اچھے ہوں تو وہ ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ تنگی اور تکلیف کی صورت میں ساتھ دیں گے۔ چونکہ رشتہ داروں کے ساتھ تعلق اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہوتا ہے اس لیے اس تعلق کو کمزور کرنا ناپسندیدہ ہے۔ جب ایک بدّو نے رسول اللہ ﷺ کی ناقہ کی نکیل پکڑ کر عرض کیا کہ مجھے وہ عمل بتائیں جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے تو آپؐ نے اسے جہاں عبادت کرنے اور شرک سے دور رہنے کی تلقین کی' وہاں یہ بھی بتایا کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلق مضبوط رکھو۔ (بحوالہ مسلم عن ابی ایوبؓ) جس قدر صلہ رحمی کی تلقین ہے اُسی قدر قطع رحمی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قطع رحمی کئی برائیوں اور گناہوں کا باعث بنتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا اور رسولؐ کے حکم سے

سرتابی ہے۔ پھر ناراضگی کی بنا پر غیبت اور بدخواہی کرتے رہنا بہت بڑا گناہ ہے۔

برادری میں کچھ لوگ خوشحال‘ دولت مند ہوجاتے ہیں یا عزّت پالیتے ہیں۔ جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اپنے ان رشتہ داروں کے حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور تعلقات خراب کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر خوش ہونا چاہیے نہ کہ حسد میں مبتلا ہوکر بدخواہی پر اُتر آیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم حسد سے بہت بچو۔ حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔‘‘ (سنن ابی داؤد عن ابی ہریرہؓ)

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ جو لوگ دولت مند اور معاشرے میں بڑا مقام حاصل کرلیتے ہیں وہ اپنے ان رشتہ داروں کو حقیر سمجھنے لگ جاتے ہیں جو نادار‘ غریب یا بے حیثیت رہ جاتے ہیں۔ اس رویے سے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں اور یہ خرابی بڑھتے بڑھتے دشمنی میں بدل جاتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ رشتہ داری کی وجہ سے ایک دوسرے کی کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ آسانی سے دوسروں کو نقصان پہنچاسکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے: الأقارب کالعقارب یعنی قریبی رشتہ دار بچھو کی مانند ہوتے ہیں۔ بہرحال رشتہ داری کو قطع کرنا دنیا اور عاقبت دونوں اعتبار سے نہایت نقصان دہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’رشتہ داری رحمٰن کی ایک شاخ ہے‘ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’(اے رشتہ داری) جو تجھے جوڑے گا میں اس سے جڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس سے کٹ جاؤں گا۔‘‘ (بخاری عن ابی ہریرہؓ)

صلہ رحمی کا یہ مطلب نہیں کہ جو رشتہ دار حسنِ سلوک کریں انہی کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے بلکہ اسلامی اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خود حسنِ سلوک ہی اپنائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو جواب میں صلہ رحمی کرے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ جب اس سے قطع رحمی کی جائے تو بھی وہ صلہ رحمی ہی کرے۔‘‘ (ترمذی‘ عن عبداللہ بن عمروؓ)
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قطع کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔‘‘ (ترمذی‘ عن جبیر بن مطعمؓ)

پس قرابت داروں کے ساتھ ہر حال میں حسنِ سلوک کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ یہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور قرآن مجید میں اس کا بار بار ذکر ہے۔

❁ ❁ ❁

تنظیم اسلامی کا پیغام — خلافتِ راشدہ کا نظام

بانی تنظیم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ — اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ — امیر تنظیم: شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ

تنظیم اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام
سالانہ اجتماع 2026ء کے قائم مقام زونل اجتماعات

یہ اجتماعات تمام زونز میں بروز ہفتہ 07 نومبر نماز عصر تا بروز پیر 09 نومبر نماز ظہر تک منعقد ہوں گے۔ تمام رفقاء تنظیم اسلامی اپنے اپنے زون کے اجتماع میں شرکت کر کے اپنی تنظیمی فکر کو تازہ کریں۔

برائے زون شرقی پاکستان حلقہ جات لاہور شرقی، لاہور غربی، گوجرانوالہ، سرگودھا

بمقام: دارُالاسلام مرکز تنظیم اسلامی 23.KM ملتان روڈ چوہنگ، لاہور

برائے رابطہ: 78-35473375(042)

برائے زون جنوبی پاکستان 1 حلقہ جات کراچی جنوبی، کراچی شرقی، حیدرآباد

برائے زون جنوبی پاکستان 2 حلقہ جات کراچی شمالی، کراچی وسطی، بلوچستان

بمقام: رائل فارمز اینڈ کنٹری ریزورٹ، کیٹی بندر روڈ گھارو، کراچی

برائے رابطہ: 0321-8110205

برائے زون شمالی پاکستان حلقہ جات اسلام آباد، پنجاب شمالی، آزاد کشمیر، پوٹھوہار

برائے زون خیبر پختونخوا حلقہ جات ملاکنڈ، خیبر پختونخوا جنوبی

بمقام: مسجد جامع القرآن کمپلیکس، پیپونٹ نز دنیلور، اسلام آباد

برائے رابطہ: 051-2751014 / 051-4866055

برائے زون وسطی پاکستان حلقہ جات فیصل آباد، ساہیوال، بہاولنگر، پنجاب جنوبی

بمقام: قرآن اکیڈمی BZU کیمپس، حامد نگر بوسن روڈ نز دبچّ ولاز، ملتان

برائے رابطہ: 061-6520451/03226187858

المعلن: ناظم اعلیٰ، تنظیم اسلامی، فون: 78-35473375(042)

Nov 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.11

Monthly Meesaq Lahore



Pakistan Standards

Kausar
BANASPATI & COOKING OILS
کچھ خاص ہے کچھ کاسنیں

KausarCookingOils

PHARMA

Your Health
Our Devotion



NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical **Manufacturing** & Marketing Company, offering **wide range of high quality branded generics in** all therapeutic categories for domestic and **international markets. Specializes in manufacturing complete range** of Oral **Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas**, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com